رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۷۳۰

جمادی الاولی ۱۳۷۰ھ

جلد ۳۵، عدد ۵


ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی


دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

خـــالی صفحـــه

# ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

جلد ۴۵ | جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ مطابق جنوری ۱۹۵۶ء | عدد ۵



ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

کئی سال کی پے در پے مایوسیوں کے بعد اب پھر یہ توقع قائم ہوئی ہے کہ ہمارے ملک کو ایک ایسا دستور مل جائے گا جسے کم از کم بنیادی طور پر اسلامی کہا جا سکے۔ اگرچہ مختلف رجحانات کی موجودگی اور ان کی کشمکش نے اس امر کے مواقع باقی نہیں چھوڑے ہیں کہ یہاں پہلے ہی مرحلے میں ایک خالص اور مکمل اسلامی نظام حکومت قائم ہو سکے، لیکن بحالتِ موجودہ یہ بھی بہت غنیمت ہو گا کہ ہماری سمتِ سفر جو اب تک لادینی کی طرف تھی، اب بدل کر اسلام کی طرف مڑ جائے اور ہم پہلا قدم صحیح رُخ پر اُٹھا سکیں۔ اس کے بعد اگر مسلسل اور پیہم جدوجہد جاری رکھی جائے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ آخر کار ہم اپنی ریاست کو ایک مکمل اور مثالی ریاست بنانے میں انشاء اللہ کامیاب ہو جائیں گے۔

---

اس موقع پر جو بات عوام اور حکومت، سب کے ذہن نشین ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ دستور کسی تعویذ کا نام نہیں ہے جس کو ریاست کے گلے میں باندھ دینے سے سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جائے۔ دستور میں ہم خواہ کتنے ہی اعلیٰ مقاصد اور پاکیزہ اصول درج کر دیں، اُن سے عملاً کوئی فرق واقع نہ ہو گا جب تک کہ حکومت اور حکام اور باشندگانِ ملک سب کے سب مل جل کر معاشرے کی اصلاح، اور خصوصاً معاشرے کے اخلاق کی تعمیر کے لیے کوشش نہ کریں۔ ہم ایک ناقص دستور سے بھی بہترین نتائج پیدا کر سکتے ہیں اگر ہماری نیت بخیر ہو اور ہم سب کا ارادہ اسلام کی بہترین رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی حالت درست کرنے کا ہو۔ اس کے برعکس کوئی کامل و مکمل دستور بھی، خواہ وہ سو فی صدی اسلامی ہو، محض اپنے الفاظ کی طاقت سے کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا، بلکہ ہم اپنے اخلاق کی خرابی اور اپنے اعمال کی شومی سے اس کو ناکام کر کے دنیا بھر میں اپنے ساتھ خود اسلام کی رسوائی کا سامان بھی کر دینگے۔ دستور کو صحیح اصولوں پر قائم کرنا بلاشبہ ضروری ہے تاکہ ایک صالح معاشرے کی تعمیر میں

اس کے نقائص رکاوٹ نہ بن سکیں۔ لیکن دستور کی اصلاح کے بعد معاشرے کی اصلاح کے لیے عملی سعی بھی اتنی ہی، بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ ایک بداخلاق معاشرہ اپنے لیے بھی مصیبت ہے اور اس حکومت کے لیے بھی جو اس کے انتظام کی ذمہ داری سنبھالے۔ کوئی بہتر سے بہتر قانون و دستور بھی ایسے معاشرے میں کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

---

اس معاملے میں ضروری ہے کہ سب سے پہلے حکومت پیش قدمی کرے۔ اُسے محض نظم و نسق چلانے والی حکومت بن کر نہ رہنا چاہیے بلکہ معاشرے کی تعمیرِ صالح کو اپنا نصب العین بنا کر کام شروع کرنا چاہیے۔ ہمارے ملک میں مدتِ دراز سے ایک ایسی حکومت قائم تھی جس کے نظریات ہم سے مختلف تھے، جس کو ہماری صلاح و فلاح سے کوئی حقیقی دلچسپی نہ تھی، اور جس کے ساتھ ہم بھی کوئی ہمدردی و خیراندیشی نہ رکھتے تھے۔ اس کے پیشِ نظر صرف امن و انتظام کو بحال رکھنا اور اپنے نظم و نسق کو بخوبی چلاتے رہنا تھا۔ معاشرے کی تعمیر کے لیے نہ وہ کوشش کرنا چاہتی تھی، نہ کر سکتی تھی اور نہ ہم یہ گوارا کر سکتے تھے کہ باہر کے فرمانروا ہماری زندگی میں کچھ زیادہ مداخلت نہ کریں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جو کچھ کیا وہ تعمیر سے زیادہ تخریب کا موجب ہوا۔ اور اپنے نظم و نسق کو چلانے میں انہوں نے جو طریقے اختیار کیے اُن کے انتخاب میں نظم و نسق کی کامیابی وہ اصل چیز تھی جو ان کے پیشِ نظر رہی۔ اس بات کی انہیں کوئی پروا نہ تھی کہ ان طریقوں سے ہمارے اخلاق بنتے ہیں یا بگڑتے ہیں۔ اب اگر ہماری قومی حکومت بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس اجنبی حکومت کی خلَف الصدق ہی بنی رہے، اور اُسی کی طرح بس اپنا نظم و نسق چلانے سے غرض رکھے، اور اُس کے لیے انہی طور طریقوں سے کام لیتی رہے جو اس کی پیش رو حکومت نے جاری کیے تھے، تو ہم قیامت تک کسی تعمیرِ نو کی امید نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر معاشرے کی اصلاح کے لیے کچھ غیر سرکاری عناصر کوشش بھی کریں اور خود معاشرے کے افراد بھی اپنی اصلاح کے خواہشمند ہوں، تب بھی حکومت کے غلط طور طریقے اُن کو اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیں گے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایک طرف حکومت اصلاح کے مقصد کو سامنے رکھ کر نئی تدبیریں اختیار کرے اور دوسری طرف معاشرے کے اصلاح پسند عناصر کا پورا تعاون اس کام میں اسے حاصل ہو۔

حکومت کی صحیح تدابیر معاشرے کو کس طرح بناتی، اور غلط تدابیر اسے کس طرح بگاڑتی ہیں، اس کو ہم ایک متعین مثال سے واضح کریں گے۔

---

عرب میں اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے لوگ اس بات سے قطعاً خوگر نہ تھے کہ کوئی باقاعدہ حکومت ان پر ٹیکس لگائے اور وہ اپنے اموال میں سے ایک حصہ نکال کر اس کے حوالہ کر دیں۔ اس ماحول میں اسلام نے پہلی مرتبہ ان پر زکوٰۃ عائد کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وصولی کے لیے عاملینِ صدقہ (تحصیلدار) مقرر کیے۔ یہ کام اگر محض نظم و نسق چلانے کے ڈھنگ پر کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ سخت خونریز لڑائیوں کے بعد ہی لوگ زکوٰۃ دینے پر آمادہ کیے جا سکتے اور ایک ایک بستی اور ایک ایک چراگاہ پر زکوٰۃ کی وصولی کے لیے فوج اور پولیس کے مضبوط دستے بھیجنے پڑتے۔ لیکن جو حکمرانی اصلاحِ معاشرہ کے نقطۂ نظر سے کی جا رہی تھی اُس نے اس کام کے لیے جو تدبیریں اختیار کیں اور پھر ان سے جو نتائج حاصل کیے وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کی کہ یہ زکوٰۃ دنیوی بادشاہیوں کے باج و خراج کی طرح نہیں ہے بلکہ ایک عبادت ہے جسے ادا کرنا تم پر اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز، روزہ اور حج فرض ہے۔ یہ مال میری جیب میں نہ جائے گا، بلکہ اس میں سے کچھ کھانا مجھ پر اور میری آل اولاد پر حرام ہے۔ یہ تمہارے مالداروں سے لیا جائے گا اور تمہارے ہی حاجت مندوں پر خرچ کیا جائے گا۔ حکومت اس خدمت کی انجام دہی کا جو انتظام کرے گی اس کا صرف واجبی خرچ وصول شدہ اموال میں سے لیا جائے گا۔ اس طرح محض تعلیم و تلقین سے اُن لوگوں کے ذہن ادائیگیٔ زکوٰۃ پر راضی کر لیے گئے جو سخت خون خچر کے بغیر کبھی اسے قبول کرنے والے نہ تھے۔ اور اس آمادگی میں بہت بڑا دخل اُس فرمانروا کی سیرت کا تھا جو ان سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس کی سیرت ہی نے لوگوں میں یہ اعتماد پیدا کیا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہی کیا بھی جائے گا۔

---

اس کے ساتھ حضور نے جو تحصیلدار تیار کیے ان کو صرف تحصیل وصول کی ٹریننگ ہی نہیں دی بلکہ ان کی

اخلاقی تربیت بھی فرمائی۔ آپ نے اُن کو بتایا کہ زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے نکلنا جہاد فی سبیل اللہ کا حکم رکھتا ہے اور جہاد ہی کا ثواب تم کو ملے گا بشرطیکہ یہ کام حق کے ساتھ کرو (العامل علی الصدقة بالحق کالغازی فی سبیل الله حتی یرجع الی بیته۔ ابوداؤد)۔ آپ نے ان کو تنبیہ فرمائی کہ زکوٰۃ کی تحصیل میں زیادتی کرنے والا اتنا ہی بڑا گناہ گار ہے جتنا زکوٰۃ نہ دینے والا، بلکہ اس کی زیادتی ہی اس بات کی موجب ہو گی کہ لوگ زکوٰۃ نہ دینے کا گناہ کرنے لگیں (المعتدی فی الصدقة کمانعها، ترمذی وابوداؤد)۔ آپ نے ان کو ہدایت کی کہ زکوٰۃ میں لوگوں کے عمدہ مال چھانٹ چھانٹ کر نہ لیں اور مظلوم کی بددعا سے بچ کر رہیں، کیونکہ اُس کے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا (ایاك وکرائم اموالهم واتق دعوة المظلوم فانها لیس بینها وبین الله حجاب، رواه الجماعة)۔ آپ نے ان کو یہ آداب بھی سکھائے کہ جس سے زکوٰۃ وصول کرو اس کے حق میں دعائے خیر کرو۔ اس دعائے خیر نے تحصیلداروں اور ٹیکس گزاروں کے تعلق کی اُس کیفیت کو بالکل ہی الٹ دیا جو دنیوی حکومتوں میں پائی جاتی ہے۔ دنیا کا دستور تو یہ تھا اور ہے کہ تحصیلدار ٹیکس گزاروں کو گالیاں دیتا ہے اور ٹیکس گزار جواب میں اسے گالیوں اور کوسنوں سے یاد کرتے ہیں۔

---

دوسری طرف آپ نے ٹیکس گزاروں کو جو ہدایات دیں وہ یہ تھیں کہ خدا کی راہ میں بُرا مال چھانٹ کر نہ دو۔ تحصیلدار جو کچھ مانگیں وہ ان کے حوالہ کر دو اور ان سے اپنا مال نہ چھپاؤ۔ تحصیلدار کو مطمئن کیے بغیر تم ادائیگی زکوٰۃ کے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ وہ خواہ ظلم کرے یا عدل، تمہیں اس کا مطالبہ پورا کرنا ہو گا۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے لوگوں سے فرمایا سیأتیکم رکب مبغضون فاذا جاؤکم فرحبوا بهم وخلوا بینهم وبین ما یبتغون فان عدلوا فلانفسهم وان ظلموا فعلیها وارضوهم فان تمام زکوتکم رضاهم۔ "تمہارے پاس وہ لوگ آئیں گے جن کا آنا تمہیں ناگوار ہو گا، مگر تم ان کا خیر مقدم کرنا اور جو کچھ وہ لینا چاہیں وہ ان کے حوالے کر دینا۔ وہ عدل کریں گے تو ان کے اپنے لیے بہتر ہے اور ظلم کریں گے تو وہ خود اس کا وبال بھگتیں گے، تم بہرحال ان کو مطمئن کرو، کیونکہ تمہاری زکوٰۃ کی تکمیل ان کے اطمینان ہی پر موقوف ہے"۔ لوگوں نے پوچھا کہ زکوٰۃ کے تحصیلدار ہم پر زیادتی کریں تو کیا ہم ان کی زیادتی کے بقدر اپنے مال ان سے

چھپا سکتے ہیں ؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔

پھر زکوٰۃ کے جو قواعد آپ نے مقرر فرمائے ان میں حق اور انصاف کا پورا لحاظ تھا، تاکہ زکوٰۃ کی تشخیص وتحصیل میں لوگوں پر کوئی ایسی زیادتی نہ ہو جو ادائیگیٔ زکوٰۃ سے جی چُرانے کی محرک بن سکے۔

---

اس انتظامی پالیسی نے تھوڑی ہی مدت میں یہ حالت پیدا کر دی کہ بہت تھوڑے خرچ پر بغیر کسی جبر یا مظاہرۂ قوت کے مملکت کی پوری زکوٰۃ بڑی سہولت سے وصول ہونے لگی۔ زکوٰۃ نہ دینے یا کم دینے کے واقعات قریب قریب ناپید ہو گئے۔ ایک محصل کسی لاؤ لشکر کے بغیر دُور دراز کی بستیوں اور چراگاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور زکوٰۃ وصول کر کے لے آتا تھا۔ کسی جھگڑے کی نوبت نہ آتی تھی۔ بلکہ جھگڑا اُلٹا اس بات پر ہوتا تھا کہ لوگ حکومت کے واجبی حق سے زیادہ دینا چاہتے تھے اور محصل لینے سے انکار کرتے تھے۔ مُسند احمد اور ابوداؤد میں یہ قصہ بیان ہوا ہے کہ حضرت اُبَیؓ بن کعب زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ایک گلہ بان کے ہاں پہنچے اور اس کے اونٹوں کو دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس پر صرف ایک بنتِ مخاض (ایک سال کی عمر کا بچۂ شتر) واجب ہے۔ گلہ بان نے کہا یہ نہ دودھ دے نہ سواری کے کام آئے، اس کے بجائے یہ جوان موٹی تازی اونٹنی حاضر ہے۔ حضرت اُبَیؓ نے کہا اس کے لینے کا تو میں مجاز نہیں ہوں۔ آخر کار وہ شخص اس اونٹنی کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور اپنی درخواست پیش کی۔ حضورؐ نے فرمایا واجب تو وہی ہے جو تمہیں بتا دیا گیا تھا، لیکن اگر تم اللہ سے اجر پانے کے لیے یہ اونٹنی دیتے ہو تو میں قبول کر لوں گا۔ اس نے کہا یہ حاضر ہے، لے لیجیے۔ چنانچہ وہ آپ نے لے لی اور اس کے حق میں برکت کی دعا فرمائی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک گلہ بان نے اپنے گلے میں سے بہترین اونٹنی نکال کر زکوٰۃ میں پیش کی اور تحصیلدار سے کہا کہ میں اپنا سب سے اچھا جانور دینا چاہتا ہوں، مگر تحصیلدار نے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک اور جانور چھانٹ کر لایا اور تحصیلدار نے اسے بھی قبول نہ کیا۔ تیسری مرتبہ جو جانور

وہ لایا اسے تحصیلدار نے لے تو لیا مگر کہا کہ میں اب بھی ڈرتا ہوں کہ کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرمائیں کہ تم ایک شخص کا اچھا مال چھانٹ لائے ہو (احمد۔ ابوداؤد۔ نسائی)۔

یہ نتائج ہیں اُس نظم و نسق کے جو اخلاقی اصلاح کو حکمرانی کا بنیادی ذریعہ بنا کر کام کرتا ہے۔ اس کی تدابیر ایک طرف کم سے کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ آمدنی حاصل کرتی ہیں اور دوسری طرف معاشرے کے اخلاقی معیار کو اتنا بلند کر دیتی ہیں کہ حکومت اور رعیت، دونوں ایک دوسرے پر پوری طرح اعتماد کر کے کامل اطمینان اور باہمی خیرسگالی کی فضا میں اپنا کام کر سکتے ہیں۔

---

اب ذرا اُس حکومت کا حال دیکھیے جو اخلاق کی فکر کیے بغیر محض نظم و نسق چلانے کی کوشش کرتی ہے۔ اُوپر چونکہ ہم نے زکوٰۃ کو مثال میں پیش کیا تھا اس لیے یہاں ہم انکم ٹیکس کو مثال میں لیتے ہیں۔ ایک مدت سے اس معاملہ میں حکومت اور ٹیکس گزاروں کے درمیان آنکھ مچولی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل رہا ہے۔ حکومت ٹیکس عائد کرنے اور اس کو وصول کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کرتی گئی وہ لوگوں میں ٹیکس سے بچنے کی ذہنیت پیدا کرتے اور زیادہ سے زیادہ بڑھاتے چلے گئے۔ حکومت نے اس کا مداوا یہ سوچا کہ ٹیکس گزار جو حساب پیش کریں اس کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے اور انکم ٹیکس کے حکام بغیر کسی ثبوت اور تحقیق کے خود جس قدر چاہیں ایک شخص کی آمدنی تجویز کر کے اس پر ٹیکس عائد کر دیں۔ لوگوں نے اس کے جواب میں بے تحاشا جھوٹے حساب رکھنے شروع کر دیئے اور افسروں نے بیچ میں سے رشوت خوری کے وسیع مواقع نکال لیے۔ اب حالت یہ ہے کہ ۹۰ فی صدی سے بھی زیادہ کاروباری لوگ جھوٹے حساب پیش کرتے ہیں اور انکم ٹیکس کے افسر باقاعدہ سرکاری ہدایات کے تحت لازماً ہر ٹیکس گزار کو جھوٹا سمجھ کر اس کے پیش کردہ حساب سے زائد، بلکہ بسا اوقات کئی کئی گنا زائد ٹیکس تجویز کر دیتے ہیں (اس کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حساب پیش کرتے وقت ہر شخص سے حلف لیا جاتا ہے کہ اس کا حساب سچا ہے اور پھر اسے جھوٹا قرار دیا جاتا ہے)۔ اس حالت میں جو تھوڑے بہت کاروباری آدمی ہمارے معاشرے میں ایسے رہ گئے ہیں جو سچے حساب رکھنا اور ٹھیک ٹھیک ٹیکس ادا کرنا چاہتے ہیں، وہ بھی جھوٹ پر مجبور ہوتے چلے جا رہے ہیں، کیونکہ وہ خواہ سو فی صدی سچے حساب

رکھیں، انکم ٹیکس آفیسر بہر حال ان کو جھوٹا ہی قرار دیتے ہیں اور ان پر اتنا ہی زائد ٹیکس لگا دیتے ہیں جتنا جھوٹے حساب والوں پر لگایا جاتا ہے۔ اس طرح سچے لوگوں کا سارا منافع ہی نہیں بلکہ اصل سرمایہ بھی مارا جاتا ہے اور ان کو مجبوراً یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یا تو کاروبار بند کر دیں یا خود بھی جھوٹے لوگوں میں جا شامل ہوں۔

---

انتظامی حیثیت سے یہ پالیسی اس لحاظ سے ناکام ہے کہ ملک کا حقیقی انکم ٹیکس کبھی پورا وصول نہیں ہوتا اور حکومت کو اسی آمدنی پر قناعت کرنی پڑتی ہے جو چھین جھپٹ سے وصول ہو جائے۔ پھر یہ کم آمدنی بھی بہت زیادہ مصارف سے حاصل ہوتی ہے۔ اور مزید براں اس پالیسی کی بدولت سرکاری عملہ میں لازماً بد دیانتی پرورش پاتی ہے۔ اس لیے محض نظم و نسق چلانے کے نقطۂ نظر سے بھی یہ صورتِ حال کسی طرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ دوسری طرف معاشرے پر اس کا جو اثر پڑ رہا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کا پورا کاروباری طبقہ جھوٹ، بے ایمانی اور دروغ حلفی کی وبائے عام میں مبتلا ہو رہا ہے۔ اور جو بچا کھچا ایک ایماندار عنصر ہماری آبادی میں باقی رہ گیا ہے اس کے لیے بھی اپنے اخلاق کو بچانا محال بلکہ غیر ممکن ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک اجنبی حکومت تو اس بات سے بے پروا ہو سکتی تھی کہ جس قوم پر وہ حکومت کر رہی ہے وہ اخلاقی حیثیت سے گرتی ہے یا اٹھتی ہے، مگر کیا ایک قومی حکومت کو بھی اس معاملہ میں بے حس رہنا چاہیے؟ ایک قومی حکومت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چیز خطرناک ہو سکتی ہے کہ جس معاشرے پر اس کی طاقت کا سارا دارومدار ہے وہ اخلاقی حیثیت سے بالکل ناقابلِ اعتماد ہو؟ معاشرہ ہی تو ریاست کی جڑ بنیاد ہے۔ یہ بنیاد اگر کمزور ہو تو اس پر ایک طاقت ور ریاست کی عمارت کیسے کھڑی رہ سکتی ہے۔ یہ وہ سوال ہے جس پر ہماری حکومت کے کارفرماؤں کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور نئی پالیسی اس طرح بنانی چاہیے کہ نظم و نسق بھی زیادہ کامیابی کے ساتھ چلے اور اس کے ساتھ وہ معاشرے کو بگاڑنے کے بجائے بنانے کا ذریعہ بھی بن سکے۔

---

جیسا کہ ہم نے اوپر انکم ٹیکس کی مثال میں بتایا ہے، ایک غلط انتظامی پالیسی حکومت اور معاشرے دونوں کو بدی کے چکر میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس کی ہر گردش دونوں طرف بدی کو بڑھاتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ رہی سہی خیر ۳۶

# تفہیم القرآن

## النُّور

(۴)

جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں[ث] وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں[۹]۔ اس واقعے کو اپنے حق

ث اشارہ ہے اُس الزام کی طرف جو حضرت عائشہ پر لگایا گیا تھا۔ اس کو اِفک کے لفظ سے تعبیر کرنا خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس الزام کی مکمل تردید ہے۔ اِفک کے معنی ہیں بات کو اُلٹ دینا، حقیقت کے خلاف کچھ سے کچھ بنا دینا۔ اسی مفہوم کے اعتبار سے یہ لفظ جھوٹ اور افترا کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اگر کسی الزام کے لیے بولا جائے تو اس کے معنی سراسر بہتان کے ہیں۔

یہاں سے اس واقعے پر کلام شروع ہوتا ہے جو اس سورے کے نزول کا اصل سبب تھا۔ دیباچے میں ہم اس کا ابتدائی قصہ خود حضرت عائشہ کی روایت سے نقل کر آئے ہیں۔ مابعد کی داستان بھی انہی کی زبان سے سنیئے۔ فرماتی ہیں: "اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اُڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضورؐ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکر اور اُمِّ رُومان (حضرت عائشہ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے، اس لیے وہ دونوں بھی پاس آکر بیٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا عائشہ، مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تمہاری براءت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو، بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سُن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ میں نے اپنے والد سے عرض کیا آپ رسول اللہ کی بات کا جواب دیں۔ انہوں نے فرمایا بیٹی، میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا آپ ہی کچھ کہیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ

میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں ـــــ اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں ـــــ تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی ـــــ اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی ـــــ تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اُس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر نہ یاد آیا۔ آخر میں نے کہا اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ (اشارہ ہے اُس واقعہ کی طرف جبکہ حضرت یعقوب کے سامنے ان کے بیٹے بن یمین پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا۔ سورۂ یوسف، رکوع ۱۰ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے)۔ یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں اُس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دیگا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی خواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرما دیگا۔ اتنے میں یکایک حضورؐ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہُوا کرتی تھی، حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی۔ مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب وہ کیفیت دُور ہوئی تو حضور بے حد خوش تھے۔ آپ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ، اللہ نے تمہاری برائت نازل فرما دی۔ اور اس کے بعد حضورؐ نے دس آیتیں سنائیں (یعنی آیت نمبر ۱۱ سے نمبر ۲۱ تک)۔ میری والدہ نے کہا کہ اُٹھو اور رسول اللہ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا میں نہ ان کا شکریہ ادا کرونگی نہ آپ دونوں کا، بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا"۔ (واضح رہے کہ یہ کسی ایک روایت کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں جتنی روایتیں حضرت عائشہ سے اس سلسلے میں مروی ہیں ان سب کو جمع کر کے ہم نے ان کا خلاصہ نکال لیا ہے)۔

اس موقع پر یہ نکتۂ لطیف بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عائشہ کی برائت بیان کرنے سے پہلے پورے ایک رکوع میں زنا اور قذف اور لعان کے احکام بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے دراصل اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے کہ زنا کے الزام

میں شمار نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے۔ؔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا

کا معاملہ کوئی تفریحی مشغلہ نہیں ہے جسے نُقلِ محفل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ الزام لگانے والے کا الزام اگر سچا ہے تو وہ گواہی لائے۔ زانی اور زانیہ کو انتہائی ہولناک سزا دی جائے گی۔ اگر جھوٹا ہے تو الزام لگانے والا اس لائق ہے کہ اس کی پیٹھ پر ۸۰ کوڑے برسا دیئے جائیں تاکہ آئندہ وہ یا کوئی اور ایسی جرأت نہ کرے۔ اور یہ الزام اگر شوہر لگائے تو عدالت میں لعان کر کے اُسے معاملہ صاف کرنا ہوگا۔ اس بات کو زبان سے نکال کر کوئی شخص بھی خیریت سے میٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ یہ مسلم معاشرہ ہے جسے دنیا میں بھلائی قائم کرنے کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ اِس میں نہ زنا ہی تفریح بن سکتی ہے اور نہ اس کے چرچے ہی خوش باشی اور دل لگی کے موضوع قرار پاسکتے ہیں۔

۹؎ روایات میں صرف چند آدمیوں کے نام ملتے ہیں جو یہ افواہیں پھیلا رہے تھے۔ عبداللہ بن اُبَی۔ زید بن رِفاعہ (جو غالباً رفاعہ بن زید یہودی منافق کا بیٹا تھا)، مِسْطَح بن اُثاثہ۔ حسان بن ثابت اور حَمْنہ بنت جَحش۔ ان میں سے پہلے دو منافق تھے اور باقی تین مومن تھے جو غلطی اور کمزوری سے اِس فتنے میں پڑ گئے تھے۔ ان کے سوا اور جو لوگ اِس گناہ میں کم و بیش مبتلا ہوئے اُن کا ذکر حدیث و سیرت کی کتابوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

۱۰؎ مطلب یہ ہے کہ گھبراؤ نہیں، منافقین نے اپنی دانست میں تو یہ بڑے زور کا وار تم پر کیا ہے مگر انشاء اللہ یہ انہی پر الٹا پڑے گا اور تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر آئے ہیں۔ منافقین نے یہ شوشہ اس لیے چھوڑا تھا کہ مسلمانوں کو اُس میدان میں شکست دیں جو ان کے تفوق کا اصل میدان تھا یعنی اخلاق جس میں فائق ہونے ہی کی وجہ سے وہ ہر میدان میں اپنے حریفوں سے بازی لیے جا رہے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی مسلمانوں کے لیے سببِ خیر بنا دیا۔ اس موقع پر ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے، دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ اور ان کے خاندان والوں نے، اور تیسری طرف عام اہلِ ایمان نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اُس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ یہ لوگ برائی سے کس قدر پاک، کیسے ضابطہ و متحمل، کیسے انصاف پسند اور کس درجہ کریم النفس واقع ہوئے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اشارہ اُن لوگوں کی گردنیں اُڑا دینے کے لیے کافی تھا جنہوں نے آپ کی عزت پر یہ حملہ کیا تھا، مگر مہینہ بھر تک آپ صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے،

اور جب اللہ کا حکم آگیا تو صرف اُن تین مسلمانوں کو، جن پر جرم قذف ثابت تھا، حد لگوا دی، منافقین کو پھر بھی کچھ نہ کہا۔
حضرت ابوبکر کا اپنا رشتہ دار، جس کی اور جس کے گھر بھر کی وہ کفالت بھی فرماتے تھے، ان کے دل و جگر پر یہ تیر چلاتا
رہا، مگر اللہ کے اُس نیک بندے نے اِس پر بھی نہ برادری کا تعلق منقطع کیا، نہ اس کی اور اس کے خاندان کی مدد ہی بند
کی۔ ازواج مطہرات میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرہ برابر حصہ نہ لیا، بلکہ کسی نے اس پر ادنیٰ درجے میں
بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا اظہار تک نہ کیا۔ حتیٰ کہ حضرت زینب کی سگی بہن حمنہ بنت جحش محض
اُن کی خاطر اُن کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انہوں نے سوکن کے حق میں کلمۂ خیر ہی کہا۔ حضرت عائشہ کی اپنی
روایت ہے کہ ازواجِ رسول اللہ میں سب سے زیادہ زینب ہی سے میرا مقابلہ رہتا تھا، مگر واقعۂ افک کے سلسلے میں
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے پوچھا کہ عائشہ کے متعلق تم کیا جانتی ہو تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ خدا
کی قسم میں اس کے اندر بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں جانتی۔ حضرت عائشہ کی اپنی شرافتِ نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت حسان
بن ثابت نے انہیں بدنام کرنے میں نمایاں حصہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت اور تواضع ہی سے پیش آتی رہیں۔
لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے آپ کو بدنام کیا تھا تو یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو دشمن
اسلام شعراء کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا۔ یہ تھا اُن لوگوں کا حال
جن کا اس معاملے سے براہِ راست تعلق تھا۔ اور عام مسلمانوں کی پاکیزہ نفسی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت
ابوایوب انصاری سے اُن کی بیوی نے جب اِن افواہوں کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے "ایوب کی ماں، اگر تم عائشہ کی
جگہ اُس موقع پر ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں؟" وہ بولیں "خدا کی قسم میں یہ حرکت ہرگز نہ کرتی"۔ حضرت ابوایوب نے
کہا "تو عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا خیال تک نہ کر سکتا
تھا، صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے"۔ اِس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے، نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا
اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق پہلے سے زیادہ نمایاں ہو گیا۔

پھر اس میں خیر کا ایک اور پہلو بھی تھا، اور وہ یہ کہ یہ واقعہ اسلام کے قوانین و احکام اور تمدنی ضوابط میں
بڑے اہم اضافوں کا موجب بن گیا۔ اِس کی بدولت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہدایات حاصل
ہوئیں جن پر عمل کر کے مسلم معاشرے کو ہمیشہ کے لیے برائیوں کی پیداوار اور ان کی اشاعت سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے،

اور جس شخص نے اِس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا[۱۱] اُس کے لیے تو عذاب عظیم ہے جس وقت تم لوگوں نے اسے سُنا تھا اُسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا[۱۲] اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟[۱۳] وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں)

اور پیدا ہو جائیں تو ان کا بروقت تدارک کیا جا سکتا ہے۔

مزید برآں اِس میں خیر کا پہلو یہ بھی تھا کہ تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں ہیں، جو کچھ اللہ بتاتا ہے وہی کچھ جانتے ہیں، اس کے ماسوا آپ کا علم اُتنا ہی کچھ ہے جتنا ایک بشر کا ہو سکتا ہے۔ ایک مہینے تک آپ حضرت عائشہؓ کے معاملے میں سخت پریشان رہے کبھی خادمہ سے پوچھتے تھے، کبھی ازواج مطہرات سے، کبھی حضرت علیؓ سے اور کبھی حضرت اسامہؓ سے۔ آخر کار حضرت عائشہؓ سے فرمایا تو یہ فرمایا کہ اگر تم نے یہ گناہ کیا ہے تو توبہ کرو اور نہیں کیا تو امید ہے اللہ تمہاری بے گناہی ثابت کر دیگا۔ اگر آپ عالم الغیب ہوتے تو یہ پریشانی اور یہ پوچھ گچھ اور یہ تلقینِ توبہ کیوں ہوتی۔ البتہ جب وحی خداوندی نے حقیقت بتا دی تو آپ کو وہ علم حاصل ہو گیا جو مہینہ بھر تک حاصل نہ تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے براہِ راست تجربے اور مشاہدے کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اُس غلو اور مبالغے سے بچانے کا انتظام فرما دیا جس میں عقیدت کا اندھا جوش بالعموم اپنے پیشواؤں کے معاملے میں لوگوں کو مبتلا کر دیتا ہے۔ بعید نہیں کہ مہینہ بھر تک وحی نہ بھیجنے میں اللہ تعالیٰ کے پیش نظر یہ بھی ایک مصلحت رہی ہو۔ اول روز ہی وحی آجاتی تو یہ فائدہ حاصل نہ ہو سکتا۔

۱۱۔ یعنی عبداللہ بن اُبَی جو اس الزام کا اصل مصنف اور فتنے کا اصل بانی تھا بعض روایات میں غلطی سے حضرت حسان بن ثابت کو اِس آیت کا مصداق بتایا گیا ہے، مگر یہ راویوں کی اپنی ہی غلط فہمی ہے ورنہ حضرت حسان کی کمزوری اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ وہ منافقوں کے پھیلائے ہوئے اس فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ حافظ ابن کثیر نے صحیح کہا ہے کہ اگر یہ روایت بخاری میں نہ ہوتی تو قابلِ ذکر تک نہ تھی۔ اِس سلسلے میں سب سے بڑا جھوٹ بلکہ بہتان یہ ہے کہ بنی اُمیّہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اِس آیت کا مصداق قرار دیا۔ بخاری، طبرانی، اور بیہقی میں ہشام بن عبدالملک اُموی کا یہ قول منقول ہے کہ الذی تولّٰی کبرہ کے مصداق علی بن ابی طالب ہیں۔ حالانکہ

حضرت علیؓ کا سرے سے اس فتنے میں کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہوں نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پریشان دیکھا تو حضور کے مشورہ لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں آپ پر کوئی تنگی تو نہیں کی ہے۔ عورتیں بہت ہیں، آپ چاہیں تو عائشہ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہ پر لگایا جارہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرت کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

ﷺ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے لوگوں، یا اپنی ملت اور اپنے معاشرے کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، اور اس ذو معنی فقرے کے استعمال میں ایک لطیف نکتہ ہے جسے خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جو صورتِ معاملہ حضرت عائشہ اور صفوان بن معطل کے ساتھ پیش آئی تھی وہ یہی تو تھی کہ قافلے کی ایک خاتون (قطع نظر اس سے کہ وہ رسول کی بیوی تھیں) اتفاق سے پیچھے رہ گئی تھیں اور قافلے ہی کا ایک آدمی جو خود اتفاق سے پیچھے رہ گیا تھا، انہیں دیکھ کر اپنے اونٹ پر ان کو بٹھا لایا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ معاذ اللہ یہ دونوں تنہا ایک دوسرے کو پا کر گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اس کا یہ کہنا اپنے ظاہر الفاظ کے پیچھے دو اور مفروضے بھی رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ قائل (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) اگر خود اس جگہ ہوتا تو کبھی گناہ کیے بغیر نہ رہتا، کیونکہ وہ اگر گناہ سے رُکا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے صنفِ مقابل کا کوئی فرد اس طرح تنہائی میں ہاتھ نہ آگیا، ورنہ ایسے نادر موقع کو وہ چھوڑنے والا نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جس معاشرے سے وہ تعلق رکھتا ہے اُس کی اخلاقی حالت کے متعلق اس کا گمان یہ ہے کہ یہاں کوئی عورت بھی ایسی نہیں ہے اور نہ کوئی مرد ایسا ہے جسے اس طرح کا کوئی موقع پیش آجائے اور وہ گناہ سے باز رہ جائے۔ یہ تو اس صورت میں ہے جبکہ معاملہ محض ایک مرد اور ایک عورت کا ہو۔ اور بالفرض اگر وہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی شہر کے رہنے والے ہوں، اور عورت جو اتفاقاً قافلے سے بچھڑ گئی تھی، اُس مرد کے کسی دوست یا رشتہ دار یا ہمسائے یا واقف کار کی بیوی، بہن، یا بیٹی ہو تو معاملہ اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔ اس کے معنی پھر یہ ہو جاتے ہیں کہ کہنے والا خود اپنی ذات کے متعلق بھی اور اپنے معاشرے کے متعلق بھی ایسا سخت گھناؤنا تصور رکھتا ہے جسے شرافت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ کون بھلا آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کے کسی دوست یا ہمسائے یا واقف کار کے گھر کی کوئی عورت

اگر اتفاق سے کہیں بھولی بھٹکی اُسے راستے میں مل جائے تو وہ پہلا کام بس اُس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے ہی کا کرے گا پھر کہیں اُسے گھر پہنچانے کی تدبیر سوچے گا۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ہزار گنا زیادہ سخت تھا۔ خاتون کوئی اور نہ تھیں، رسول اللہ کی بیوی تھیں جنہیں ہر مسلمان اپنی ماں سے بڑھ کر احترام کے لائق سمجھتا تھا، جنہیں اللہ نے خود ہر مسلمان پر ماں کی طرح حرام قرار دیا تھا۔ مرد نہ صرف یہ کہ اسی قافلے کا ایک آدمی، اسی فوج کا ایک سپاہی اور اسی شہر کا ایک شہری تھا، بلکہ وہ مسلمان تھا، اُن خاتون کے شوہر کو اللہ کا رسول اور اپنا ہادی و پیشوا مانتا تھا، اور اُن کے فرمان پر جان قربان کرنے کے لیے جنگِ بدر جیسے خطرناک معرکے میں شریک ہو چکا تھا۔ اس صورت حال میں تو اس قول کا ذہنی پس منظر گھناؤنے پن کی اُس انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس سے بڑھ کر کسی گندے تخیل کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ مسلم معاشرے کے جن افراد نے یہ بات زبان سے نکالی یا اسے کم از کم شک کے قابل خیال کیا اُنہوں نے خود اپنے نفس کا بھی بہت بُرا تصور قائم کیا اور اپنے معاشرے کے لوگوں کو بھی بڑے ذلیل اخلاق و کردار کا مالک سمجھا۔

۱۳؎ یعنی یہ بات تو قابلِ غور تک نہ تھی۔ اسے تو سنتے ہی ہر مسلمان کو سراسر جھوٹ اور کذب و افتراء کہہ دینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کوئی شخص یہاں یہ سوال کرے کہ جب یہ بات تھی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے کیوں نہ اول روز ہی جھٹلا دیا اور کیوں انہوں نے اسے اتنی اہمیت دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شوہر اور باپ کی پوزیشن عام آدمیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک شوہر سے بڑھ کر کوئی اپنی بیوی کو نہیں جان سکتا اور ایک شریف و صالح بیوی کے متعلق کوئی صحیح الدماغ شوہر لوگوں کے بہتانوں پر فی الواقع بدگمان نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس کی بیوی پر الزام لگا دیا جائے تو وہ اس مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ اسے بہتان کہہ کر رد کر بھی دے تو کہنے والوں کی زبان نہ رُکے گی، بلکہ وہ اس پر اُلٹا ایک اور ردا یہ چڑھائیں گے کہ بیوی نے میاں صاحب کی عقل پر کیسا پردہ ڈال رکھا ہے، سب کچھ کر رہی ہے اور میاں یہ سمجھتے ہیں کہ میری بیوی بڑی پاکدامن ہے۔ ایسی ہی مشکل ماں باپ کو پیش آتی ہے۔ وہ غریب اپنی بیٹی کی عصمت پر صریح جھوٹے الزام کی تردید میں اگر زبان کھولیں بھی تو بیٹی کی پوزیشن صاف نہیں ہوتی۔ کہنے والے یہی کہیں گے کہ ماں باپ ہیں، اپنی بیٹی کی حمایت نہ کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ یہی چیز تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت

چار گواہ کیوں نہ لائے ؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں[16]۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آ لیتا۔ (ذرا غور تو کرو، اُس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے) جبکہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اِس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور

---

ابو بکر اور اُم رومان کو اندر ہی اندر غم سے گھلائے دے رہی تھی۔ ورنہ حقیقت میں کوئی شک ان کو لاحق نہ تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خطبے ہی میں صاف فرما دیا تھا کہ میں نے اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے اور نہ اُس شخص میں جس کے متعلق یہ الزام لگایا جا رہا ہے۔

[16] "اللہ کے نزدیک" یعنی اللہ کے قانون میں، یا اللہ کے قانون کے مطابق۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو الزام بجائے خود جھوٹا تھا، اس کا جھوٹ ہونا اس بات پر مبنی نہ تھا کہ یہ لوگ گواہ نہیں لائے ہیں۔

اس جگہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہاں الزام کے غلط ہونے کی دلیل اور بنیاد محض گواہوں کی غیر موجودگی کو ٹھیرایا جا رہا ہے۔ اور مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی صرف اِس وجہ سے اس کو صریح بہتان قرار دو کہ الزام لگانے والے چار گواہ نہیں لائے ہیں۔ یہ غلط فہمی اُس صورتِ واقعہ کو نگاہ میں نہ رکھنے سے پیدا ہوتی ہے جو فی الواقع وہاں پیش آئی تھی۔ الزام لگانے والوں نے الزام اس وجہ سے نہیں لگایا تھا کہ انہوں نے، یا ان میں سے کسی شخص نے وہ بات دیکھی تھی جو وہ زبان سے نکال رہے تھے، بلکہ صرف اس بنیاد پر اتنا بڑا الزام تصنیف کر ڈالا تھا کہ حضرت عائشہ قافلے سے پیچھے رہ گئی تھیں اور صفوان بعد میں ان کو اپنے اونٹ پر سوار کر کے قافلے میں لے آئے۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی بھی اس موقع پر یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ حضرت عائشہ کا اس طرح پیچھے رہ جانا، معاذ اللہ کسی ساز باز کا نتیجہ تھا۔ ساز باز کرنے والے اس طریقہ سے تو ساز باز نہیں کیا کرتے کہ سالارِ لشکر کی بیوی چپکے سے قافلے کے پیچھے ایک شخص کے ساتھ رہ جائے اور پھر وہی شخص اس کو اپنے اونٹ پر بٹھا کر دن دہاڑے، ٹھیک دوپہر کے وقت لیے ہوئے علانیہ لشکر کے پڑاؤ پر پہنچے۔ یہ صورتِ حال خود ہی ان دونوں کی معصومیت پر دلالت کر رہی تھی۔ اِس حالت میں اگر الزام لگایا جا سکتا تھا تو صرف اِس بنیاد پر ہی لگایا جا سکتا تھا کہ کہنے والوں نے اپنی آنکھوں سے کوئی معاملہ دیکھا ہو۔ ورنہ قرائن، جن پر ظالموں نے

اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم نے اسے ایک معمولی بات سمجھا، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے"۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم[۱۵] ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں[۱۶]۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے[۱۷]۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو

الزام کی بنا رکھی تھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رکھتے تھے۔

۱۵؎ ان آیات سے، اور خصوصاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کہ "مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے گروہ کے لوگوں سے نیک گمان کیوں نہ کیا" یہ قاعدۂ کلیہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشرے میں تمام معاملات کی بنا حسنِ ظن پر ہونی چاہیے، اور سوءِ ظن صرف اس حالت میں کیا جانا چاہیے جبکہ اس کے لیے کوئی ثبوتی وایجابی بنیاد ہو۔ اصول یہ ہے کہ ہر شخص بے گناہ ہے جب تک کہ اس کے مجرم ہونے یا اس پر جرم کا شبہ کرنے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہ ہو اور ہر شخص اپنی بات میں سچا ہے جب تک کہ اس کے ساقط الاعتبار ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔

۱۶؎ موقع و محل کے لحاظ سے تو آیت کا براہِ راست مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے الزامات گھڑ کر اور انہیں اشاعت دے کر مسلم معاشرے میں بداخلاقی پھیلانے اور امتِ مسلمہ کے اخلاق پر دھبہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن آیت کے الفاظ فحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ ان کا اطلاق عملاً بدکاری کے اڈے قائم کرنے پر بھی ہوتا ہے اور بداخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لیے جذبات کو اکسانے والے قصوں، اشعار، گانوں، تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلب اور ہوٹل اور دوسرے ادارے بھی ان کی زد میں آ جاتے ہیں جن میں مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ سب لوگ مجرم ہیں۔ صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی ان کو سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعتِ فحش کے ان تمام ذرائع و وسائل کا سدِّباب کرے۔ اُس کے قانونِ تعزیرات میں اُن تمام افعال

(یہ چیز جو ابھی تمہارے اندر پھیلائی گئی تھی بدترین نتائج دکھا دیتی)، حق یہ ہے کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے۔ ع

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ اس کی پیروی کوئی کرے گا تو وہ تو اسے فحش اور بدی ہی کا حکم دے گا۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا۔[۱۸] مگر اللہ ہی جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔[۱۹]

تم میں سے جو لوگ صاحبِ فضل اور صاحبِ مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور اور

---

کو مستوجبِ سزا، قابلِ دست اندازیِ پولیس ہونا چاہیے جن کو قرآن یہاں پبلک کے خلاف جرائم قرار دے رہا ہے اور فیصلہ کر رہا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

۱۷ یعنی تم لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کی ایک ایک حرکت کے اثرات معاشرے میں کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں، کتنے افراد کو متاثر کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کا کس قدر نقصان اجتماعی زندگی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس چیز کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرو اور جن برائیوں کی وہ نشان دہی کر رہا ہے انہیں پوری قوت سے مٹانے اور دبانے کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ رواداری برتی جائے۔ در اصل یہ بڑی باتیں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

۱۸ یعنی شیطان تو تمہیں برائی کی نجاستوں میں آلودہ کرنے کے لیے اس طرح تلا بیٹھا ہے کہ اگر اللہ اپنے فضل و کرم سے تم کو نیک و بد کی تمیز نہ سمجھائے اور تم کو اصلاح کی تعلیم و توفیق سے نہ نوازے تو تم میں سے کوئی شخص بھی اپنے بل بوتے پر پاک نہ ہو سکے۔

۱۹ یعنی اللہ کی یہ مشیت، کہ وہ کسے پاکیزگی بخشے، اندھا دھند نہیں ہے بلکہ علم کی بنا پر ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ کس میں بھلائی کی طلب موجود ہے اور کون برائی کی رغبت رکھتا ہے۔ ہر شخص اپنی خلوتوں میں بھی جو باتیں کرتا ہے انہیں اللہ سن رہا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے دل میں بھی جو کچھ سوچا کرتا ہے، اللہ اس سے بے خبر نہیں رہتا۔ اسی براہِ راست علم کی بنا پر اللہ فیصلہ کرتا ہے کہ کسے پاکیزگی بخشے اور کسے نہ بخشے۔

رحیم ہے۔[۲۲]

[۲۲] حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مذکورۂ بالا آیتوں میں جب اللہ تعالیٰ نے میری برأت نازل فرما دی تو حضرت ابوبکرؓ نے قسم کھالی کہ وہ آئندہ کے لیے مسطح بن اُثاثہ کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے، کیونکہ انھوں نے نہ رشتہ داری کا کوئی لحاظ کیا اور نہ اُن احسانات ہی کی کچھ شرم کی جو وہ ساری عمر اُن پر اور اُن کے خاندان پر کرتے رہے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کو سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ نے فوراً کہا بلیٰ واللہ انا نحب ان تغفر لنا یا ربنا۔ "واللہ ضرور ہم چاہتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو ہماری خطائیں معاف فرمائے۔" چنانچہ آپ نے پھر مسطح کی مدد شروع کر دی اور پہلے سے زیادہ ان پر احسان کرنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ یہ قسم حضرت ابوبکرؓ کے علاوہ بعض اور صحابہ نے بھی کھائی تھی کہ جن جن لوگوں نے اس بہتان میں حصہ لیا ہے ان کی وہ کوئی مدد نہ کریں گے۔ اس آیت کے نزول کے بعد اُن سب نے اپنے عہد سے رجوع کر لیا۔ اس طرح وہ تلخی آناً فاناً دور ہو گئی جو اس فتنے نے پھیلا دی تھی۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کی قسم کھائے، پھر بعد میں اسے معلوم ہو کہ اس میں بھلائی نہیں ہے اور وہ اس سے رجوع کر کے وہ بات اختیار کرے جس میں بھلائی ہے تو آیا اسے قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے یا نہیں۔ فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہی قسم کا کفارہ ہے، اس کے سوا کسی اور کفارے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کا حکم دیا اور کفارہ ادا کرنے کی ہدایت نہیں فرمائی۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو بھی وہ دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیراً منھا فلیأت الذی ھو خیر وذالک کفارتہ (جو شخص کسی بات کی قسم کھائے، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے تو اسے وہی بات کرنی چاہیے جو بہتر ہے اور یہ بہتر بات کو اختیار کر لینا ہی اس کا کفارہ ہے)۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قسم توڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک صاف اور مطلق حکم نازل فرما چکا ہے (تفہیم القرآن ج ۱، ص ۱۷۱، ۵۰۰) جسے اس آیت نے نہ تو منسوخ ہی کیا ہے اور نہ صاف الفاظ میں اس کے اندر کوئی ترمیم ہی کی ہے۔ اس لیے وہ حکم اپنی جگہ باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت ابوبکرؓ کو قسم توڑ دینے کے لیے تو ضرور فرمایا ہے مگر یہ نہیں فرمایا کہ تم پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہے۔

جو لوگ پاک دامن، بے خبر،[۲۱] مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں اُن کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ وہ بدلہ انہیں بھرپور دے دیگا جس کے وہ مستحق ہیں اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ ہی حق ہے سچ کو سچ کر دکھلانے والا۔

خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے۔ پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، اُن کا دامن پاک ہے اُن باتوں سے جو بنانے والے بناتے ہیں،[۲۲] ان کے لیے مغفرت ہے اور رزقِ کریم ع ۳ع

---

رہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک غلط یا نامناسب بات کی قسم کھا لینے سے جو گناہ ہوتا ہے وہ مناسب بات اختیار کر لینے سے دُھل جاتا ہے۔ اِس ارشاد کا مقصد کفارۂ قسم کو ساقط کر دینا نہیں ہے چنانچہ دوسری حدیث اس کی توضیح کر دیتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے من حلف علیٰ یمین فرأی غیرھا خیرًا منھا فلیأت الذی ھو خیر ولیکفر عن یمینہ (جس نے کسی بات کی قسم کھائی ہو، پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے، اسے چاہیے کہ وہی بات کرے جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے)۔ اس سے معلوم ہُوا کہ قسم توڑنے کا کفارہ اور چیز ہے اور بھلائی نہ کرنے کے گناہ کا کفارہ اور چیز۔ ایک چیز کا کفارہ بھلائی کو اختیار کر لینا ہے اور دوسری چیز کا کفارہ وہ ہے جو قرآن نے خود مقرر کر دیا ہے۔

[۲۱] اصل میں لفظ غافلات استعمال ہُوا ہے جس سے مراد ہیں وہ سیدھی سادھی شریف عورتیں جو چھل بٹے نہیں جانتیں، جن کے دل پاک ہیں، جنہیں کچھ خبر نہیں کہ بدچلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے، جن کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ اندیشہ نہیں گزرتا کہ کبھی کوئی ان پر بھی الزام لگا بیٹھے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا اُن سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو "موبقات" (تباہ کن) ہیں۔ اور طبرانی میں حضرت حُذیفہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا قذف المحصنۃ یھدم عمل مأۃ سنۃ "ایک پاکدامن عورت پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کر دینے کے لیے کافی ہے۔"

[۲۲] اس آیت میں ایک اصولی بات سمجھائی گئی ہے کہ خبیثوں کا جوڑ خبیثوں ہی سے لگتا ہے، اور پاکیزہ لوگ

پاکیزہ لوگوں ہی سے طبعی مناسبت رکھتے ہیں۔ ایک بدکار آدمی صرف ایک ہی برائی نہیں کیا کرتا ہے کہ اور تو سب حیثیتوں سے وہ بالکل ٹھیک ہو مگر بس ایک بُرائی میں مبتلا ہو۔ اس کے تو اطوار، عادات، خصائل ہر چیز میں بہت سی برائیاں ہوتی ہیں جو اس کی ایک بڑی برائی کو سہارا دیتی اور پرورش کرتی ہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک آدمی میں یکایک کوئی ایک برائی کسی ازغیبی گولے کی طرح پھٹ پڑے جس کی کوئی علامت اس کے چال چلن میں اور اس کے رنگ ڈھنگ میں نہ پائی جاتی ہو۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا تم ہر وقت انسانی زندگیوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اب کس طرح تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ ایک پاکیزہ انسان جس کی ساری زندگی سے تم واقف ہو، کسی ایسی عورت سے نباہ کرے اور برسوں نہایت محبت کے ساتھ نباہ کیے چلا جاتا ہے جو زناکار ہو۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ کوئی عورت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو بدکار بھی ہو اور پھر اس کی رفتار، گفتار، انداز، اطوار، کسی چیز سے بھی اس کے بُرے لچھن ظاہر نہ ہوتے ہوں؟ یا ایک شخص پاکیزہ نفس اور بلند اخلاق بھی ہو اور پھر ایسی عورت سے خوش بھی رہے جس کے یہ لچھن ہوں؟ یہ بات یہاں اس لیے سمجھائی جا رہی ہے کہ آئندہ اگر کسی پر کوئی الزام لگایا جائے تو لوگ اندھوں کی طرح اسے بس سنتے ہی نہ مان لیا کریں بلکہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ کس پر الزام لگایا جا رہا ہے، کیا الزام لگایا جا رہا ہے، اور وہ کسی طرح وہاں چسپاں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ بات لگتی ہوئی ہو تو آدمی ایک حد تک اسے مان سکتا ہے، یا کم از کم ممکن اور متوقع سمجھ سکتا ہے۔ مگر ایک انوکھی بات جس کی صداقت کی تائید کرنے والے آثار کہیں نہ پائے جاتے ہوں صرف اس لیے کیسے مان لی جائے کہ کسی احمق یا خبیث نے اسے مُنہ سے خارج کر دیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب بھی بیان کیا ہے کہ بُری باتیں بُرے لوگوں کے لیے ہیں (یعنی وہ ان کے مستحق ہیں) اور بھلی باتیں بھلے لوگوں کے لیے ہیں اور بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ باتیں ان پر چسپاں ہوں جو بدگو اشخاص ان کے بارے میں کہتے ہیں۔ بعض دوسرے لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بُرے اعمال بُرے ہی لوگوں کو سجتے ہیں اور نیک اعمال نیک ہی لوگوں کو سزاوار ہیں، نیک لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ بُرے اعمال ان پر چسپاں ہوں جو منسوب کرنے والے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ بُری باتیں بُرے ہی لوگوں کے کرنے کی ہیں اور بھلے لوگ بھلی باتیں ہی کیا کرتے ہیں بھلے لوگ اس سے پاک ہیں کہ وہ اس طرح کی باتیں کریں جیسی یہ افترا پرداز لوگ کر رہے ہیں۔ آیت کے الفاظ میں ان سب تفسیروں کی

اے۲۳ے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ

گنجائش ہے۔ لیکن ان الفاظ کو پڑھ کر پہلا مفہوم جو ذہن میں آتا ہے وہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے بھی جو معقولیت اس میں ہے وہ ان دوسرے مفہومات میں نہیں ہے۔

۲۳ے سورے کے آغاز میں جو احکام دیئے گئے تھے وہ اس لیے تھے کہ معاشرے میں برائی رونما ہو جائے تو اس کا تدارک کیسے کیا جائے۔ اب وہ احکام دیئے جا رہے ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سرے سے برائیوں کی پیدائش ہی کو روک دیا جائے اور تمدن کے طور طریقوں کی اصلاح کر کے اُن اسباب کا سدباب کر دیا جائے جن سے اس طرح کی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ ان احکام کا مطالعہ کرنے سے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں:۔

اوّل یہ کہ واقعۂ افک پر تبصرہ کرنے کے معاً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تشخیص میں زوجۂ رسول جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نفوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دید سے اور آزادانہ میل جول سے روکا جائے، عورتوں کو ایک قریبی حلقے کے سوا غیر محرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے، قحبہ گری کے پیشے کا قطعی انسداد کیا جائے، مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مجرّد نہ رہنے دیا جائے، اور لونڈی غلاموں تک کے تجرّد کا مداوا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عورتوں کی بے پردگی، اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مجرّد رہنا، اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت ساری و جاری رہتی ہے اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں، اُن کے کان، اُن کی زبانیں، ان کے دل، سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (SCANDAL) میں پڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان احکام سے زیادہ صحیح و مناسب اور مؤثر کوئی دوسری تدبیر نہ تھی، ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

گھر والوں کی رضا نہ لے لو[۲۶] اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو، یہ طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے، توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے[۲۷]۔ پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ[۲۸] تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دے دی

دوسری بات جو اس موقع پر سمجھ لینی چاہیے وہ یہ ہے کہ شریعتِ الٰہی کسی برائی کو محض حرام کر دینے، یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی، بلکہ وہ اُن اسباب کا بھی خاتمہ کر دینے کی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اُس برائی میں مبتلا ہونے پر اُکساتے ہوں، یا اس کے لیے مواقع بہم پہنچاتے ہوں، یا اس پر مجبور کر دیتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسبابِ جرم، محرّکاتِ جرم اور وسائل و ذرائعِ جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے تاکہ آدمی کو اصل جُرم کی عین سرحد پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹہلتے رہیں اور روز پکڑے جائیں اور سزائیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (PROSECUTOR) ہی نہیں ہے، بلکہ ہمدرد، مُصلح اور مددگار بھی ہے، اس لیے وہ تمام تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کے لیے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو برائیوں سے بچنے میں مدد دی جائے۔

[۲۶] اصل میں لفظ حتیٰ تستانسوا استعمال ہوا ہے، جس کو عموماً لوگوں نے حتیٰ تستاذنوا کے معنی میں لیا ہے، لیکن درحقیقت دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے جس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اگر حتیٰ تستاذنوا فرمایا جاتا تو آیت کے معنی یہ ہوتے کہ "لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو"۔ اس طرزِ تعبیر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حتیٰ تستانسوا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ استیناس کا مادہ اُنس ہے جو اُردو زبان میں بھی اُسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس مادّے سے استیناس کا لفظ جب بولیں گے تو اس کے معنی ہوں گے اُنس معلوم کرنا، یا اپنے سے مانوس کرنا۔ پس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ "لوگوں کے گھروں میں نہ داخل ہو جب تک کہ ان کو مانوس نہ کر لو یا اُن کا اُنس معلوم نہ کر لو"، یعنی یہ معلوم نہ کر لو کہ تمہارا آنا صاحبِ خانہ کو ناگوار تو نہیں ہے، وہ پسند کرتا ہے کہ تم اس کے گھر میں داخل ہو۔ اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ "اجازت لینے" کے بجائے "رضا لینے" کے الفاظ سے کیا ہے کیونکہ یہ مفہوم اصل سے قریب تر ہے۔

[۲۷] جاہلیت میں اہلِ عرب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حُیّیتم صباحاً، حُیّیتم مساءً (صبح بخیر، شام بخیر) کہتے ہوئے بے تکلف ایک دوسرے کے گھر میں گھس جاتے تھے اور بسا اوقات گھر والوں پر اور ان کی عورتوں پر

نادیدنی حالت میں نگاہیں پڑ جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح کے لیے یہ اصول مقرر کیا کہ ہر شخص کو اپنے رہنے کی جگہ میں تخلیے (PRIVACY) کا حق حاصل ہے اور کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کے تخلیے میں اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر خلل انداز ہو۔ اس حکم کے نازل ہونے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں جو آداب اور قواعد جاری فرمائے انہیں ہم ذیل میں نمبروار بیان کرتے ہیں:۔

(۱) حضورؐ نے تخلیے کے اس حق کو صرف گھر میں داخل ہونے کے سوال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حق قرار دیا جس کی رُو سے دوسرے کے گھر میں جھانکنا، باہر سے نگاہ ڈالنا، حتیٰ کہ دوسرے کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی ممنوع ہے۔ حضرت ثوبان (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اذا دخل البصر فلا اذن "جب نگاہ داخل ہو گئی تو پھر خود داخل ہونے کے لیے اجازت مانگنے کا کیا موقع رہا" (ابوداؤد)۔ حضرت ہُزَیل بن شُرحبیل کہتے ہیں ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوا اور عین دروازے پر کھڑا ہو کر اجازت مانگنے لگا۔ حضورؐ نے اسے فرمایا ھٰکذا عنك، فانما الاستیذان من النظر "پرے ہٹ کر کھڑے ہو، اجازت مانگنے کا حکم تو اسی لیے ہے کہ نگاہ نہ پڑے" (ابوداؤد)۔ حضورؐ کا اپنا قاعدہ یہ تھا کہ جب کسی کے ہاں تشریف لے جاتے تو دروازے کے عین سامنے کھڑے نہ ہوتے کیونکہ اُس زمانے میں گھروں کے دروازوں پر پردے نہ لٹکائے جاتے تھے۔ آپ دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اجازت طلب فرمایا کرتے تھے (ابوداؤد)۔ حضرت اَنس خادمِ رسول اللہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرت کے حجرے میں باہر سے جھانکا۔ حضورؐ اس وقت ایک تیر ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ آپ اس کی طرف اس طرح بڑھے جیسے کہ اس کے پیٹ میں بھونک دیں گے (ابوداؤد)۔ حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا من نظر فی کتاب اخیه بغیر اذنه فانما ینظر فی النار "جس نے اپنے بھائی کی اجازت کے بغیر اُس کے خط میں نظر دوڑائی وہ گویا آگ میں جھانکتا ہے" (ابوداؤد)۔ صحیحین میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لوان امرأً اطلع علیك بغیر اذن فخذفته بحصاة ففقأت عینه ما کان علیك من جناح، "اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے اور تو ایک کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو کچھ گناہ نہیں"۔ اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں ہے من اطلع دار قوم بغیر اذنهم ففقؤا عینه فقد هدرت عینه "جس نے

کسی کے گھر میں جھانکا اور گھر والوں نے اس کی آنکھ پھوڑ دی تو ان پر کچھ مؤاخذہ نہیں ۔" امام شافعی نے اس ارشاد کو بالکل لفظی معنوں میں لیا ہے اور وہ جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑ دینے کو جائز رکھتے ہیں۔ لیکن حنفیہ اس کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ یہ حکم محض نگاہ ڈالنے کی صورت میں نہیں ہے بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص گھر میں بلا اجازت گھس آئے اور گھر والوں کے روکنے پر وہ باز نہ آئے اور گھر والے اس کی مزاحمت کریں۔ اس کشمکش اور مزاحمت میں اس کی آنکھ پھوٹ جائے یا کوئی اور عضو ٹوٹ جائے تو گھر والوں پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا (احکام القرآن جصاص۔ ج ۳۔ ص ۳۸۵)

(۲) فقہاء نے نگاہ ہی کے حکم میں سماعت کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً اندھا آدمی اگر بلا اجازت آئے تو اس کی نگاہ نہ پڑے گی، مگر اس کے کان تو گھر والوں کی باتیں بلا اجازت سنیں گے۔ یہ چیز بھی نظر ہی کی طرح تخلیہ کے حق میں بے جا مداخلت ہے۔

(۳) اجازت لینے کا حکم صرف دوسروں کے گھر جانے کی صورت ہی میں نہیں ہے بلکہ خود اپنی ماں بہنوں کے پاس جانے کی صورت میں بھی ہے۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میں اپنی ماں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس نے کہا میرے سوا ان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں ہے کیا ہر بار جب میں ان کے پاس جاؤں تو اجازت مانگوں؟ فرمایا اتحب ان تراھا عریانۃ "کیا تو پسند کرتا ہے کہ اپنی ماں کو برہنہ دیکھے؟" (ابن جریر عن عطاء بن یسار مرسلاً) عبداللہ بن مسعود کا قول ہے علیکم ان تستاذنوا علی امھاتکم واخواتکم "اپنی ماں بہنوں کے پاس بھی جاؤ تو اجازت لے کر جاؤ۔" (ابن کثیر)۔ بلکہ ابن مسعود تو کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے پاس جاتے ہوئے بھی آدمی کو کم از کم کھنکار دینا چاہیے۔ ان کی بیوی زینب کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جب کبھی گھر میں آنے لگتے تو پہلے کوئی ایسی آواز کر دیتے تھے جس سے معلوم ہو جائے کہ وہ آرہے ہیں۔ وہ اسے پسند نہ کرتے تھے کہ اچانک گھر میں آن کھڑے ہوں (ابن جریر)

(۴) اجازت طلب کرنے کے حکم سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کسی کے گھر پر اچانک کوئی مصیبت آجائے، مثلاً آگ لگ جائے یا کوئی چور گھس آئے۔ ایسے مواقع پر مدد کے لیے بلا اجازت جا سکتے ہیں۔

(۵) اول اول جب استیذان کا قاعدہ مقرر کیا گیا تو لوگ اس کے آداب سے واقف نہ تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آیا اور دروازے پر سے پکار کر کہنے لگا أألج (کیا میں گھس آؤں؟)۔ نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے اپنی لونڈی روضہ سے فرمایا یہ شخص اجازت مانگنے کا طریقہ نہیں جانتا۔ ذرا اُٹھ کر اسے بتا کہ یوں کہنا چاہیے السلام علیکم۔ اَ اَدْخُلُ (ابن جریر۔ ابوداؤد۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں اپنے مرحوم والد کے قرضوں کے سلسلے میں آنحضرت کے ہاں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ نے پوچھا کون ہے؟ میں نے عرض کیا "میں ہوں"۔ آپ نے دو تین مرتبہ فرمایا "میں ہوں، میں ہوں"؟ یعنی اس میں ہوں سے کوئی کیا سمجھے کہ تم کون ہو (ابوداؤد)۔ ایک صاحب کلدہ بن حنبل ایک کام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گئے اور سلام کیے بغیر یونہی جا بیٹھے۔ آپ نے فرمایا باہر جاؤ، اور السلام علیکم کہہ کر اندر آؤ (ابوداؤد)۔ استیذان کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ آدمی اپنا نام بتا کر اجازت طلب کرے۔ حضرت عمر کے متعلق روایت ہے کہ وہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے السلام علیک یا رسول اللہ ، ایدخل عمر (ابوداؤد)۔ اجازت لینے کے لیے حضور نے زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ پکارنے کی حد مقرر کر دی اور فرمایا اگر تیسری مرتبہ پکارنے پر بھی جواب نہ آئے تو واپس ہو جاؤ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ یہی حضور کا اپنا طریقہ بھی تھا۔ ایک مرتبہ آپ حضرت سعد بن عُبادہ کے ہاں گئے اور السلام علیکم و رحمۃ اللہ کہہ کر دو دفعہ اجازت طلب کی، مگر اندر سے جواب نہ آیا۔ تیسری مرتبہ جواب نہ ملنے پر آپ واپس ہو گئے۔ حضرت سعد اندر سے دوڑ کر آئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ میں آپ کی آواز سن رہا تھا، مگر میرا جی چاہتا تھا کہ آپ کی زبان مبارک سے میرے لیے جتنی بار بھی سلام و رحمت کی دعا نکل جائے اچھا ہے، اس لیے میں بہت آہستہ آہستہ جواب دیتا رہا (ابوداؤد۔ احمد)۔ یہ تین مرتبہ پکارنا پے در پے نہ ہونا چاہیے، بلکہ ذرا ٹھیر ٹھیر کر پکارنا چاہیے تاکہ صاحب خانہ کو اگر کوئی مشغولیت جواب دینے میں مانع ہو تو اسے فارغ ہونے کا موقع مل جائے۔

(۶) اجازت یا تو خود صاحب خانہ کی معتبر ہے یا پھر کسی ایسے شخص کی جس کے متعلق آدمی یہ سمجھنے میں حق بجانب ہو کہ وہ صاحب خانہ کی طرف سے اجازت دے رہا ہے، مثلاً گھر کا خادم یا کوئی اور ذمہ دار قسم کا فرد۔ کوئی چھوٹا سا بچہ اگر کہہ دے کہ آجاؤ تو اس پر اعتماد کر کے داخل نہ ہو جانا چاہیے۔

(۷) اجازت طلب کرنے میں بے جا اصرار کرنا، یا اجازت نہ ملنے کی صورت میں دروازے پر جم کر کھڑے ہو جانا جائز نہیں ہے۔ اگر تین دفعہ استیذان کے بعد صاحب خانہ کی طرف سے اجازت نہ ملے، یا وہ ملنے سے انکار کر دے تو واپس چلے جانا چاہیے۔

جائے[26]، اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ[27]، یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ البتہ تمہارے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایسے گھروں میں داخل ہو جاؤ جو کسی کے رہنے کی جگہ نہ ہوں اور جن میں تمہارے فائدے (یا کام) کی کوئی چیز ہو[28]، تم جو کچھ ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو سب کی اللہ کو خبر ہے۔

اے نبی، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں[29] اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں[30]، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔

---

۲۶ یعنی کسی کے خالی گھر میں داخل ہو جانا جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ صاحب خانہ نے آدمی کو خود اس بات کی اجازت دی ہو۔ مثلاً اس نے آپ سے کہہ دیا ہو کہ اگر میں موجود نہ ہوں تو آپ میرے کمرے میں بیٹھ جائیے گا، یا وہ کسی اور جگہ پر ہو اور آپ کی اطلاع ملنے پر وہ کہلا بھیجے کہ آپ تشریف رکھیے، میں ابھی آتا ہوں۔ ورنہ محض یہ بات کہ مکان میں کوئی نہیں ہے، یا اندر سے کوئی نہیں بولتا، کسی کے لیے یہ جائز نہیں کر دیتی کہ وہ بلا اجازت داخل ہو جائے۔

۲۷ یعنی اس پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔ ایک آدمی کو حق ہے کہ وہ کسی سے نہ ملنا چاہے تو انکار کر دے، یا کوئی مشغولیت ملاقات میں مانع ہو تو معذرت کر دے۔ اِرْجِعُوا (واپس ہو جاؤ) کے حکم کا فقہاء نے یہ مطلب لیا ہے کہ اس صورت میں دروازے کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے کی اجازت نہیں ہے بلکہ آدمی کو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو ملاقات پر مجبور کرے، یا اس کے دروازے پر ٹھیر کر اسے تنگ کرنے کی کوشش کرے۔

۲۸ اس سے مراد ہیں ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دوکانیں، مسافر خانے وغیرہ جہاں لوگوں کے لیے داخلہ کی عام اجازت ہو۔

۲۹ اصل میں الفاظ ہیں یَغُضُّوا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ غَضّ کے معنی ہیں کسی چیز کو کم کرنے، گھٹانے اور پست کرنے کے۔ غضِ بصر کا ترجمہ عام طور پر نگاہ نیچی کرنا یا رکھنا کیا جاتا ہے، لیکن دراصل اس کا مطلب ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ پوری طرح نگاہ بھر کر نہ دیکھنا، اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا

ہے۔ یہ مفہوم "نظر بچانے" سے ٹھیک ادا ہوتا ہے۔ یعنی جس چیز کو دیکھنا مناسب نہ ہو اُس سے نظر ہٹا لی جائے، قطع نظر اس سے کہ آدمی نگاہ نیچی کرے یا کسی اور طرف اسے بچا لے جائے۔ مِنْ اَبْصَارِهِمْ میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے۔ یعنی حکم تمام نظروں کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ بعض نظروں کو بچانے کا ہے۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کا منشا یہ نہیں ہے کہ کسی چیز کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھا جائے، بلکہ وہ صرف ایک مخصوص دائرے میں نگاہ پر یہ پابندی عائد کرنا چاہتا ہے۔ اب یہ بات سیاق و سباق سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ پابندی جس چیز پر عائد کی گئی ہے وہ ہے مردوں کا عورتوں کو دیکھنا، یا دوسرے لوگوں کے ستر پر نگاہ ڈالنا، یا فحش مناظر پر نگاہ جمانا۔

کتاب اللہ کے اس حکم کی جو تشریح سنت نے کی ہے اس کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) آدمی کے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے، لیکن یہ معاف نہیں ہے کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو وہاں پھر نظر دوڑائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنے تمام حواس سے زنا کرتا ہے۔ دیکھنا آنکھوں کی زنا ہے۔ لگاوٹ کی بات چیت زبان کی زنا ہے۔ آواز سے لذت لینا کانوں کی زنا ہے۔ ہاتھ لگانا اور ناجائز مقصد کے لیے چلنا ہاتھ پاؤں کی زنا ہے۔ بدکاری کی یہ ساری تمہیدیں جب پوری ہو چکتی ہیں تب شرمگاہیں یا تو اس کی تکمیل کر دیتی ہیں، یا تکمیل کرنے سے رہ جاتی ہیں (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔ حضرت بُریدہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا یا علی لاتُتبع النظرۃ النظرۃ فان لک الاولیٰ ولیست لک الاخرۃ، "اے علی ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا پہلی نظر تو معاف ہے مگر دوسری نظر معاف نہیں" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، دارمی)۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اچانک نگاہ پڑ جائے تو کیا کروں۔ فرمایا فوراً نگاہ پھیر لو، یا نیچی کر لو (مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان النظر سہم من سہام ابلیس مسموم، من ترکہا مخافتی ابدلتہ ایمانا یجد حلاوتہ فی قلبہ، "نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے، جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت

وہ اپنے دل میں پائے گا" (طبرانی)۔ ابو امامہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ما من مسلم ینظر الی محاسن امرأۃ ثم یغض بصرہ الا اخلف اللہ لہ عبادۃ یجد حلاوتہا "جس مسلمان کی نگاہ کسی عورت کے حسن پر پڑے اور وہ نگاہ ہٹا لے تو اللہ اس کی عبادت میں لطف اور لذت پیدا کر دیتا ہے" (مسند احمد)۔ امام جعفر صادق اپنے والد امام محمد باقرؒ سے اور وہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی فضل بن عباس (جو اُس وقت ایک نوجوان لڑکے تھے) مَشعرِ حرام سے واپسی کے وقت حضورؐ کے ساتھ اُونٹ پر سوار تھے۔ راستے سے جب عورتیں گزرنے لگیں تو فضل ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مُنہ پر ہاتھ رکھا اور اسے دوسری طرف پھیر دیا (ابوداؤد)۔ اسی حجۃ الوداع کا قصہ ہے کہ قبیلۂ خَثعَم کی ایک عورت راستہ میں حضورؐ کو روک کر حج کے متعلق ایک مسئلہ پوچھنے لگی اور فضل بن عباس نے اُس پر نگاہیں گاڑ دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا منہ پکڑ کر دوسری طرف کر دیا۔ (بخاری، ابوداؤد، ترمذی)

(۲) اِس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو کھلے مُنہ پھرنے کی عام اجازت تھی تبھی تو غضِ بصر کا حکم دیا گیا، ورنہ اگر چہرے کا پردہ رائج کیا جا چکا ہوتا تو پھر نظر بچانے یا نہ بچانے کا کیا سوال۔ یہ استدلال عقلی حیثیت سے بھی غلط ہے اور واقعہ کے اعتبار سے بھی۔ عقلی حیثیت سے یہ اس لیے غلط ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہو جانے کے باوجود ایسے مواقع پیش آ سکتے ہیں جبکہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے۔ اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے۔ اور مسلمان عورتوں میں پردہ رائج ہونے کے باوجود بہر حال غیر مسلم عورتیں تو بے پردہ ہی رہیں گی۔ لہٰذا محض غضِ بصر کا حکم اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ عورتوں کے کھلے منہ پھرنے کو مستلزم ہے۔ اور واقعہ کے اعتبار سے اس لیے غلط ہے کہ سورۂ احزاب میں احکامِ حجاب نازل ہونے کے بعد جو پردہ مسلم معاشرے میں رائج کیا گیا تھا اس میں چہرے کا پردہ شامل تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اس کا رائج ہونا بکثرت روایات سے ثابت ہے۔ واقعۂ اِفک کے متعلق حضرت عائشہؓ کا بیان جو نہایت معتبر سندوں سے مروی ہے اُس میں وہ فرماتی ہیں کہ جنگل سے واپس آکر جب میں نے دیکھا کہ قافلہ چلا گیا ہے تو میں بیٹھ گئی اور نیند کا غلبہ ایسا ہوا کہ وہیں پڑ کر سو گئی۔ صبح کو صفوان بن مُعَطَّل وہاں سے گزرا تو دُور سے کسی کو پڑے دیکھ کر اُدھر آ گیا۔ فعرفنی حین رآنی وکان قد رآنی قبل

الحجاب فاستیقظت باسترجاعه حین عرفنی فخمرت وجھی بجلبابی" وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا کیونکہ حجاب کے حکم سے پہلے وہ مجھے دیکھ چکا تھا مجھے پہچان کر جب اس نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا تو اس کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنی چادر سے منہ ڈھانک لیا" (بخاری، مسلم، احمد، ابن جریر، سیرت ابن ہشام)۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک خاتون اُم خلاد کا لڑکا ایک جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ وہ اس کے متعلق دریافت کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں، مگر اس حال میں بھی چہرے پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ بعض صحابہ نے حیرت کے ساتھ کہا کہ اس وقت بھی تمہارے چہرے پر نقاب ہے؟ یعنی بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر تو ایک ماں کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا، اور تم اس اطمینان کے ساتھ باپردہ آئی ہو۔ جواب میں کہنے لگیں ان ارزأ ابنی فلن ارزأ حیائی "میں نے بیٹا تو ضرور کھویا ہے مگر اپنی حیا تو نہیں کھودی" ابوداؤد ہی میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ ایک عورت نے پردے کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو درخواست دی۔ حضورؐ نے پوچھا یہ عورت کا ہاتھ ہے یا مرد کا؟ اس نے عرض کیا عورت ہی کا ہے۔ فرمایا "عورت کا ہاتھ ہے تو کم از کم ناخن ہی مہندی سے رنگ لیے ہوتے" رہے حج کے موقع کے وہ دو واقعات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے تو وہ عہد نبوی میں چہرے کا پردہ نہ ہونے کی دلیل نہیں بن سکتے، کیونکہ احرام کے لباس میں نقاب کا استعمال ممنوع ہے۔ تاہم اس حالت میں بھی محتاط خواتین غیر مردوں کے سامنے چہرہ کھول دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں ہم لوگ بحالتِ احرام مکہ کی طرف جا رہے تھے۔ جب مسافر ہمارے پاس سے گزرنے لگتے تو ہم عورتیں اپنے سر سے چادریں کھینچ کر منہ پر ڈال لیتیں، اور جب وہ گزر جاتے تو ہم منہ کھول لیتی تھیں" (ابوداؤد، باب فی المحرمۃ تغطی وجہہا)۔

(۳) غضِ بصر کے اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو۔ اس غرض کے لیے عورت کو دیکھ لینے کی نہ صرف اجازت ہے، بلکہ ایسا کرنا کم از کم مستحب تو ضرور ہے۔ مُغیرہ بن شُعبہ کی روایت ہے کہ میں نے ایک جگہ نکاح کا پیغام دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے لڑکی کو دیکھ بھی لیا ہے۔ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا انظر الیہا

فانہ احری ان یُّؤدَمَ بینکما" اسے دیکھ لو۔ اس طرح زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تمہارے درمیان موافقت ہوگی" (احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی)۔ ابوہریرہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے کہیں شادی کا پیغام دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انظرالیھا فان فی اعین الانصار شیئا" لڑکی کو دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ خرابی ہوتی ہے" (مسلم، نسائی، احمد)۔ جابر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا اذا خطب احدکم المرأۃ فقدر ان یری منھا بعض ما یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل" تم میں سے جب کوئی شخص کسی عورت سے نکاح کا خواستگار ہو تو حتی الامکان اُسے دیکھ کر یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ آیا عورت میں ایسی کوئی خوبی ہے جو اس کے ساتھ نکاح کی طرف راغب کرنے والی ہو (احمد، ابوداؤد)۔ مُسند احمد میں ابوحُمَیدہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے اس غرض کے لیے دیکھنے کی اجازت کو فلاجُناح علیہ کے الفاظ میں بیان کیا، یعنی ایسا کر لینے میں مضائقہ نہیں ہے۔ نیز اس کی بھی اجازت دی کہ لڑکی کی بے خبری میں بھی اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی سے فقہاء نے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ بضرورت دیکھنے کی دوسری صورتیں بھی جائز ہیں۔ مثلاً تفتیش جرائم کے سلسلے میں کسی مشتبہ عورت کو دیکھنا، یا عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کا کسی گواہ عورت کو دیکھنا، یا علاج کے لیے طبیب کا مریضہ کو دیکھنا وغیرہ۔

(۴) غضِ بصر کے حکم کا منشا یہ بھی ہے کہ آدمی کسی عورت یا مرد کے ستر پر نگاہ نہ ڈالے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا تنظر المرأۃ الی عورۃ المرأۃ" کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے، اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو نہ دیکھے" (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی)۔ حضرت علی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا لا تنظر الی فخذ حی ولا میت" کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران پر نگاہ نہ ڈالو" (ابوداؤد، ابن ماجہ)۔

نمبر ۳۰ شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد محض ناجائز شہوت رانی سے پرہیز ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے سے پرہیز بھی ہے۔ مرد کے لیے ستر کے حدود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائے ہیں۔ عورۃ الرجل ما بین سُرَّتِہٖ الی رُکبَتِہٖ" مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے" (دارقطنی، بیہقی)۔ اس حصۂ جسم کو بیوی کے سوا کسی کے سامنے قصداً کھولنا حرام ہے۔ حضرت

جَرْهَدِ اَسلمی، جو اصحابِ صُفّہ میں سے ایک بزرگ تھے، روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کھلی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا اما علمت ان الفخذ عورۃ "کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کے قابل چیز ہے؟" (ترمذی، ابوداؤد، مؤطا)۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لا تبرز (یا لا تکشف) فخذک "اپنی ران کبھی نہ کھولو" (ابوداؤد، ابن ماجہ)۔ صرف دوسروں کے سامنے ہی نہیں تنہائی میں بھی ننگا رہنا ممنوع ہے۔ چنانچہ حضورؐ کا ارشاد ہے ایاکم والتعرّی فان معکم من لا یفارقکم الا عند الغائط وحین یفضی الرجل الی اھلہ، فاستحیوھم واکرموھم "خبردار، کبھی ننگے نہ رہو کیونکہ تمہارے ساتھ وہ ہیں جو کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے (یعنی خیر اور رحمت کے فرشتے) سوائے اس وقت کے جب تم رفع حاجت کرتے ہو یا اپنی بیویوں کے پاس جاتے ہو۔ لہٰذا ان سے شرم کرو اور ان کا احترام ملحوظ رکھو" (ترمذی)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا احفظ عورتک الا من زوجتک او ما ملکت یمینک "اپنے ستر کو اپنی بیوی اور لونڈی کے سوا ہر ایک سے محفوظ رکھو"۔ سائل نے پوچھا اور جب ہم تنہائی میں ہوں؟ فرمایا فاللہ تبارک وتعالیٰ احق ان یستحیا منہ "تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرم کی جائے" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔

# مذہب اور قانون کا باہمی رشتہ

(سر الفریڈ ڈیننگ)

[ یہ مضمون سر الفریڈ ڈیننگ (SIR ALFRED DENNING) کی ایک تازہ ترین کتاب "بدلتا ہوا قانون" (THE CHAGING LAW) کے آخری باب کا ترجمہ ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے مصنف ملکۂ برطانیہ کی کورٹ آف اپیل کے ایک جج ہیں۔ یہ مضمون ہمارے تعلیم یافتہ طبقے، خصوصاً ہمارے قانون ساز اور قانون دان حضرات کے لیے قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے مذہبی مبلغین اور اخلاقی مصلحین و مفکرین ہی نہیں، بلکہ وہاں کے بعض مقننین بھی اس حقیقت کو کھلے دل سے تسلیم کر رہے ہیں کہ مذہب کو بنیاد بنائے بغیر کوئی دستوری، قانونی یا اجتماعی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون سے اس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب کے پاس جس صورت میں بھی اور جو کچھ بھی بچا کھچا اثاثہ مسیحیت کی تعلیمات کا موجود ہے، وہاں کے قانون دان کس طرح اسے اپنے سینوں سے چمٹا کر قانون سازی کے کام میں اس کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک طرف یورپ کے یہ قانون دان ہیں جو بڑی تشویش کے ساتھ اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی حیاتِ اجتماعی سے اگر مذہب کی کارفرمائی غائب ہو گئی اور قوانین کی مذہبی بنیادوں کو منہدم کر دیا گیا، تو کوئی قانونی نظام بھی کامیابی سے نہیں چل سکے گا۔ دوسری طرف ہمارے قانون ساز ہیں جنہیں ہر ایسی تجویز پر پریشانی اور ناگواری محسوس ہونے لگتی ہے جس میں اسلام کو دستور اور قانون کا ماخذ اور بنیاد قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا ہو ]۔

عہدِ قدیم میں مذہب اور قانون کا تعلق بہت ہی گہرا تھا مگر جدید زمانے میں مذہب کا قانون پر کوئی نمایاں اثر باقی نہیں رہا ہے۔ گزشتہ ادوار میں مذہب، اخلاق اور قانون اجزائے لاینفک کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً تورات کے احکامِ عشرہ میں سے پہلا حکم "مذہبی" نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں: "خدا نے فرمایا کہ میں خداوند تیرا خدا ہوں، تیرا کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے میرے"۔ پانچواں حکم اخلاقی نوعیت کا ہے جس کے

الفاظ یہ ہیں: "اپنے والدین کی عزت کر تاکہ تیرا قیام اُس زمین میں دراز ہو جو تجھے خدا عطا کرے۔" آٹھواں حکم ایک قانونی فریضہ ہے اور اس کی عبارت یہ ہے "تو ہرگز چوری نہ کر۔" قدیم مذاہب و اقوام سب میں یہی صورت حال تھی۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ مذہب، اخلاق اور قانون تینوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ اس تفریق و امتیاز کو اب بہت دُور تک پہنچا دیا گیا ہے، حتیٰ کہ بہت سے لوگوں میں اب یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب، اور قانون کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان لوگوں کا مقولہ یہ ہے کہ "مذہب خدا اور انسان کے کے تعلقات متعین کرتا ہے اور قانون ایک انسان اور دوسرے انسان کے تعلقات کا تعین کرتا ہے۔" اسی طرح ان لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ قانون کا اخلاق سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ قانون بہر حال واجب الاتباع ہے خواہ وہ اخلاقی لحاظ سے صحیح ہو یا غلط۔ قانون کا مقصد معاشرے میں نظم و ضبط کو برقرار رکھنا ہے نہ کہ عدل و انصاف کو قائم کرنا۔

میری دانست میں تفریق و انقطاع کا یہ تصور حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اگرچہ مذہب اور قانون کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے، تاہم یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں بہت بڑی حد تک ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ مذہب کے بغیر اخلاق کا وجود ناممکن ہے اور اخلاق کے بغیر قانون کا وجود محال ہے۔ آئیے میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کروں کہ ہمارے قانون کے بنیادی اصول کس طرح عیسائیت کی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

**صداقت**

سب سے پہلے ہم حق و صداقت کے اصول کو لیتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہمیشہ سچ بولنا ہر آدمی کا بنیادی فریضہ ہے۔ اب اگر مذہب، اخلاق اور قانون کے تقاضوں سے قطع نظر کر کے محض مصلحت وقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حق پرستی کے خلاف بھی اتنے ہی دلائل دیئے جا سکتے ہیں، جتنے اس کے حق میں دیئے جا سکتے ہیں۔ انگریزی میں ایک ضرب المثل ہے کہ "دیانت و صداقت بہترین پالیسی ہے" لیکن ایک مصلحت بین انسان کی نگاہ میں اس ضرب المثل پر کاربند ہونا دانشمندانہ نہیں، بلکہ سراسر ایک احمقانہ فعل قرار پائے گا۔ اگر جھوٹ بولنے سے اس کا مقصد حاصل ہوگا تو وہ ضرور جھوٹ بولے گا اور دلیل یہ دے گا کہ اصل اعتبار مقصد کا ہے نہ کہ ذریعے کا۔ مثلاً ایک مصلحت پرست انسان کے خلاف اگر یہ الزام عائد کیا جائے کہ وہ نشے کی حالت میں کار چلا رہا تھا تو وہ بڑی آسانی سے انکار

کر دیگا خواہ یہ الزام صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ سے ہمیں صرف اس لیے نفرت ہے کہ ہمیں اپنے والدین نے اس وقت سچ بولنے کی تعلیم دی تھی جبکہ اُن کی آغوشِ عاطفت میں ہمارے اندر بھلے اور بُرے کی تمیز پیدا ہو رہی تھی۔ ہمیں دینِ مسیحیت نے یہ سکھایا ہے کہ ہم ہمیشہ اور ہر حال میں سچ بولیں سینٹ پال نے فرمایا تھا "جھوٹ کو ترک کر کے ہر آدمی اپنے ہمسائے کے سامنے سچ بولے۔ کیونکہ ہم ایک ہی برادری کے افراد ہیں"۔ ہمارے اندر غصے اور ناراضگی کے جذبات سب سے زیادہ اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے سامنے دروغ گوئی سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری شخصیت کی کوئی توہین نہیں ہو سکتی۔ نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا آدمی ہمیں دھوکا دے اور نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم کسی دوسرے کو دھوکا دیں۔

مقدس فریب | بعض مذہبی خیال رکھنے والے لوگ خاص حالات میں نیک مقصد کے لیے جھوٹ بول لینے کو جائز سمجھتے ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ ایک زمانے میں اسے جائز قرار دیتا تھا مثلاً حضرت مسیح اور دوسرے صلحاء کی زندگیوں کے بارے میں افسانے گھڑ کر انہیں حقیقی واقعات کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے مقصود ایمان واعتقاد کو پختہ کرنا تھا، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ایک فریب تھا۔ اسی کے نتیجے میں "مقدس فریب" (PIOUS FRAUD) کی اصطلاح وضع کی گئی جو اب ہماری زبان میں عام رائج ہو چکی ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ایک مثال وہ دروغِ مصلحت آمیز ہے جس کا ارتکاب ایک معالج اپنے مریض کے سامنے کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کے نزدیک یہ فعل مریض کے حق میں نفع بخش ہوتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ "ہمسائے سے سچ بولنے" کا حکم قطعی اور مطلق ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے نزدیک حق گوئی ایک قطعی فریضہ ہے جس میں کسی استثناء کی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے حق میں صرف اس دلیل کو کافی سمجھا ہے کہ جھوٹ بولنے والے کو عالمِ آخرت میں حیاتِ طیبہ نصیب نہیں ہو سکتی۔ موجودہ دور میں کانٹ اور بعض دیگر مفکرین کا بھی یہی خیال ہے کہ ہر حالت میں سچ بولنا قطعی ضروری ہے۔ آپ یہاں یہ سوال کر سکتے ہیں کہ حالتِ جنگ میں کیا دشمن کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بولا جا سکتا ہے؟ لیکن ایک سچا عیسائی اس کا بجا طور پر یہ جواب دے سکتا ہے کہ جو دشمن ہمیں تباہ و برباد کرنے کے درپے ہے

اُس پر "مسایہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اُس سے سچ کہنا ضروری ہے۔

**قانون اور صداقت** اب آپ قانون کو لیجیے قانون کی نگاہ میں بھی سچ بولنا نہایت ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک خالص سچائی منظر عام پر نہ آئے، قانون اور عدل کے تقاضے کبھی بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ قانون اور عدل کی محافظت اور تنفیذ کا بہت بڑا ذریعہ ہمارا عدالتی نظام ہے لیکن اگر فریقین اور گواہ عدالتوں میں سچ بولنے سے گریز کریں تو انصاف کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے قیام کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوں گی۔ اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حق پرستی، جس کا اصل سرچشمہ مذہبی تعلیم ہے، قانون کے بقا کے لیے کس قدر ضروری ہے اور مذہب و قانون کا باہمی تعلق کتنا گہرا اور بنیادی ہے۔ یہاں میں جملۂ معترضہ کے طور پر اتنی بات ضرور کہوں گا کہ میرا یہ استدلال ایک مفروضے پر مبنی ہے اور یہ استدلال اُسی صورت میں صحیح ہو گا جبکہ قانون بذاتِ خود عادلانہ ہو اور عدالتوں میں بیٹھنے والے جج خود بھی حق و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہوں۔ اگر قانون ظالمانہ ہو گا یا عدلیہ کے علمبردار اس کے نفاذ و اجرا میں انصاف پسندی سے کام نہیں لیں گے تو عدالتوں میں پیش ہونے والے گواہوں کے اندر لازماً یہ رجحان پیدا ہو گا کہ وہ "مقدس فریب" سے کام لے کر دروغ بیانی کریں۔ ہمارے ہاں ایک زمانہ وہ تھا کہ چالیس شلنگ قیمت کی چوری کی سزا موت تھی۔ اس کا نتیجہ ایک مرتبہ یہ نکلا تھا کہ پانچ پونڈ کے ایک مسروقہ نوٹ کے بارے میں جیوری نے پوری سنجیدگی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس نوٹ کی قدر و قیمت انتالیس شلنگ سے ہرگز زائد نہیں ہے اور اس اعلان کو کسی نے بھی قابلِ مذمت نہیں سمجھا تھا۔ بہرحال قانون کا صرف واضح اور متعین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ اس کی کامرانی کے لیے اس کا مبنی بر انصاف ہونا بھی ضروری ہے۔

**حلف کی اہمیت** سچائی کے لازمۂ قانون و انصاف ہونے اور اس کی ضرورت مسلّم ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر کی عدالتیں سچ بولنے پر اصرار کرتی ہیں اور ہر گواہ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ سچ بولنے کی قسم اٹھائے۔ قانون کے نقطۂ نظر سے مذہبی تصورات و اعتقادات کی اہمیت کی اس سے زیادہ واضح مثال ہمارے قانونی نظام میں مشکل سے ملے گی۔ گویا ہمارے قانون کا بنیادی مفروضہ اور نقطۂ آغاز یہ ہے کہ ہر شخص خدا پر ایمان رکھتا ہے اور وہ خدا اور ایمان کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولے گا۔ عدالتوں کے قیام پر صدیاں گزر چکی ہیں، لیکن آج بھی جو شخص گواہ کے

کٹہرے کے سامنے آتا ہے اُسے سب سے پہلے حلف اُٹھانا پڑتا ہے۔ اس فعل کے تقدس کے پیش نظر عدالت میں ایک خاموش فضا پیدا کی جاتی ہے۔ گواہ اپنے ہاتھ میں مقدس کتاب لیتا ہے اور یہ الفاظ کہتا ہے: "میں خدائے بزرگ و برتر کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں سچی گواہی دونگا۔ میں سچائی، مکمل سچائی پیش کرونگا اور سچائی کے سوا کچھ پیش نہیں کروں گا"۔ گواہ کے ہاتھ میں جو مقدس کتاب دی جاتی ہے وہ انجیل (NEW TESTAMENT) ہوتی ہے الا یہ کہ گواہ کسی دوسری کتاب کا مطالبہ کرے۔ جس وقت گواہ یہ قسم اُٹھاتا ہے تو وہ صرف جج ہی کو یہ باور نہیں کرا رہا ہوتا کہ وہ سچ بول رہا ہے بلکہ وہ اپنے خدا کے سامنے یہ پختہ عہد باندھ رہا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ "مقدس فریب" اور "جزوی صداقت" HALF TRUTH خدا کے ہاں کسی کام کی نہیں ہے۔

ایک عامی سے عامی اور جاہل سے جاہل آدمی بھی جب کٹہرے میں آتا ہے تو اسے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے۔ ویسٹرن سرکٹ کی ایک عدالت میں اس واقعہ کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے کہ ایک گواہ نے قسم سے پہلے معمول کے مطابق کلمات دُہرانے کے بعد یہ بھی کہا تھا۔ کہ اگر میں جھوٹ بولوں تو خدا میری جان یہیں قبض کر لے"۔ چنانچہ وہ شخص وہیں دھڑام سے گرا اور گر کر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ اس جگہ پر اُس وقت ایک پتھر نصب کر دیا گیا تھا جو اب تک اس واقعہ کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ اگر گواہ کسی ایسے مذہب یا عقیدے کا پیرو ہو جس کے لحاظ سے قسم کی کوئی دوسری شکل مناسب ہو تو عدالت میں اسی کو اختیار کیا جاتا ہے۔ گواہ کو بہر حال ایسی قسم اُٹھانی پڑتی ہے جو اُسے اپنے ضمیر و اخلاق کے مطابق سچ بولنے کے لیے پابند کر دیتی ہو۔

اس بحث سے آپ کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قانون کا منشا اور تقاضا صرف اتنا ہے کہ محض عدالت میں قسم کھا کر سچ بولنا ضروری ہے اور دوسرے مواقع پر جھوٹ بولنے میں ہرج نہیں ہے۔ نہیں! ہرگز نہیں!! ہر انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جب بھی کسی دوسرے انسان سے کوئی معاملہ کرے تو اس میں حق و صداقت کی روش پر کاربند رہے۔ قانون جتنا اس معاملے میں سخت گیر اور متشدد ہے، اتنا کسی دوسرے میں نہیں ہے۔ وہ کسی پس و پیش اور ہیرا پھیری (EVASION) کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر ایک بیان محض الفاظ کی حد تک صحیح ہو لیکن اس میں سے کسی ایسے حصے کو قصداً حذف کر دیا گیا ہو، جس کی وجہ سے

غلط تاثر پیدا ہوتا ہو، تو ایسا بیان ایک "فریب" ہے۔ جیسا کہ لارڈ کلسینٹ (LORD KYLSANT) کو ایک مرتبہ خسارہ اٹھانے کے بعد اس تلخ حقیقت کا علم ہوا تھا۔ انہوں نے کیا یہ تھا کہ ایک کمپنی کے منافع جات کے اعداد و شمار تو انہوں نے شائع کر دیئے مگر نقصانات کے اعداد شائع نہیں کیے۔ اس سے کمپنی کی مالی حیثیت کا بہت غلط اندازہ ہوتا تھا۔ لارڈ موصوف کو اس کے نتیجے میں ایک سال جیل کی ہوا کھانی پڑی

غلط بیانی اور فریب دہی وغیرہ کے بارے میں ہمارے ہاں جتنے بھی قوانین نافذ ہیں ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ کسی آدمی کو کذب بیانی سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہ دی جائے گی بشرطیکہ قانون میں کچھ بھی گنجائش ہو۔ کسی عذر یا تاویل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کسی نیک مقصد کے لیے بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکیزہ مقصد کے لیے ذریعہ بھی پاکیزہ ہونا چاہیے"۔ اس معاملے میں ہمارا قانون تو بلاشبہ بہت مضبوط اور معقول ہے مگر میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قانون تنہا کافی نہیں ہے۔ اگر لوگوں کے اندر مذہب کی سچی روح موجود ہو تو محض قانونی ضمانات بالکل بے کار اور لاطائل ہیں۔ کیا دیانت و امانت کے آج کل ناپید ہونے کی اصل وجہ الحاد و بے دینی نہیں ہے؟ بیشتر گواہ جو ہمارے سامنے پیش ہوتے ہیں وہ حلف کی تقدیس کا کچھ بھی لحاظ نہیں رکھتے اور ایسا بیان دیتے ہیں جو اُن کے خیال میں اُن کے مقدمے کے لیے مفید ہو، خواہ وہ سچ ہو یا جھوٹ ہو۔

ایفائے عہد یا وعدے کو پورا کرنا بھی سچ بولنے سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ زبور کے الفاظ میں "کھرا آدمی صرف وہی نہیں ہے جو زبان کو جھوٹ سے آلودہ نہ کرے بلکہ وہ ہے جو ہمسائے سے وعدہ کر کے اُسے مایوس نہ کرے، خواہ اُسے خود تکلیف کا سامنا کرنا پڑے"۔ اس اصول کو ہمارے قانون میں بڑا دخل ہے۔ ہمارا قانون معاہدات مختلف مراحل میں سے گزرتا رہا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ صرف قانونی دستاویز پر لکھا ہوا اور مُہر شدہ معاہدہ قابلِ وثوق سمجھا جاتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جبکہ صرف وہ معاہدہ لازم قرار دیا جاتا تھا جس کے عوض میں کچھ مالی لین دین عمل میں لایا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں ان تکلفات و رسوم کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ آج کل اگر ایک انسان ایسا وعدہ کرتا ہے جس کی پابندی لازمی قرار دی جائے اور جس کی بنا پر دوسرا فریق کوئی کارروائی کر لیتا ہے، تو اب اس کارروائی کے وقوع میں آجانے کے بعد اُس وعدے کی

پابندی از روئے قانون واجب ہو جاتی ہے۔

مطبوعہ معاہدات | معاہدات کی حفاظت کے لیے ہمارے قانون کا مستعد ہونا بڑی خوش آئند بات ہے۔ لیکن بعض حالات میں یہ قانونیت حد سے تجاوز کر جاتی ہے۔ اس تجاوز کی سب سے واضح مثال ہمارے قانون کا وہ رویہ ہے جو اس نے مطبوعہ اور لگے بندھے معاہدات (STANDARDISED CONTRACTS) کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے۔ انشورنس کمپنیاں، بنک اور دوسرے تجارتی اور صنعتی ادارے معاہدے کے چھپے چھپائے فارم تیار رکھتے ہیں جن میں بے شمار شرائط درج ہوتی ہیں۔ ایک عام آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ یا تو ان ساری شرائط پر دستخط کرے یا پھر ان اداروں سے کوئی معاملہ ہی نہ کرے۔ ان پر دستخط کرنے والے افراد بالعموم اول تو ان ساری شرائط کو پڑھتے نہیں اور اگر پڑھ بھی لیں تو سمجھتے نہیں۔ لیکن دستخط کرنے کے بعد ایک شخص ان شرائط کے ساتھ ایسا بندھ جاتا ہے گویا کہ اُس نے ان میں سے ایک ایک شرط کو عمداً پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے۔ پھر جب ان شرائط کی تعبیر و تشریح کا مرحلہ آتا ہے تو معاہدے کی لفظی پابندی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ اگر معاہدہ کرنے والا احتجاج کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "مجھے ایسی نادیدہ صورت حال کا پیشگی کچھ بھی علم و تصور نہ تھا" تو اُسے جواب دیا جاتا ہے کہ "یہ تمہارا اپنا قصور ہے، تمہیں ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے تھا"۔ لیکن میرے خیال میں یہ قانونی روش صحیح نہیں ہے اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں اس کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اگر سینٹ طامس ایکوی ناس (ST. THOMAS ACQUINAS) ہوتے تو وہ یقیناً دستخط کرنے والے کو معذور قرار دیتے۔ فریقین میں سے ہر ایک کے اندر حُسنِ نیت (GOOD FAITH) کی موجودگی ضروری ہے۔ کسی ایک فریق کو اس کا موقع نہیں دیا جانا چاہیے کہ وہ بال کی کھال نکال کر الفاظ میں سے ایسا مفہوم برآمد کرے جو دوسرے فریق کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا ہو۔ قوانینِ ملکی کی تعبیر میں بھی ایسی دقتیں پیش آتی ہیں۔ بعض حالات میں منصفانہ قوانین کے الفاظ کو بھی ایسے معنی پہنا لیے جاتے ہیں جو قانون سازوں کے منشا کے بالکل خلاف ہوتے ہیں اور جن سے انصاف کے تقاضے بُری طرح پامال ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون بڑا غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کرتا ہے اور جج یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ "پارلیمنٹ کے پاس کردہ قوانین کے رخنوں کو پُر کرنا ہمارا کام نہیں ہے"۔

**لفظی موشگافیاں** میرا خیال یہ ہے کہ معاہدات اور قوانین کی تشریح میں اس قسم کی موشگافیاں سچائی کے بنیادی اور حقیقی تصور کے قطعاً منافی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان الفاظ پر حاکم ہونے کے بجائے ان کا محکوم بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر آپ انجیل پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ محض الفاظ کی غلامی کی کتنی مذمت کی گئی ہے اس سلسلے کی نمایاں مثال وہ واقعہ ہے جو یوم سبت سے متعلق ہے۔ تورات کا چوتھا حکم یہ ہے کہ "سبت کے دن تو کوئی کام نہ کر" ایک مرتبہ حضرت مسیحؑ کے حواری گندم کے کھیت میں سے گزر رہے تھے اور ہفتے (سبت) کا دن تھا۔ انہوں نے خوشے توڑنے شروع کر دیے۔ فریسیوں نے کہا کہ "سبت کے دن یہ لوگ فعل حرام کا ارتکاب کیوں کر رہے ہیں" حضرت مسیحؑ نے فرمایا "سبت انسان کے لیے بنایا گیا ہے نہ کہ انسان سبت کے لیے"۔ سینٹ پال نے اسی حقیقت کو ان جامع اور مختصر الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "الفاظ جان لیوا ہیں مگر معانی جان بخش ہیں"۔ کسی زمانے میں ہمارے انگریزی قانون میں اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں بائیبل کا نیا نیا ترجمہ انگریزی میں ہوا تھا۔ ہمارے جج اسے پڑھا کرتے تھے اور اُن کے فیصلے بلاشبہ اس سے اثر پذیر ہوا کرتے تھے۔ وہ قانون کی محض لفظی تعبیر پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ اُس خرابی یا کمزوری کو بھی نگاہ میں رکھتے تھے جسے رفع کرنے کے لیے قانون بنایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ قانون سازوں کے مقصود و مدعا (INTENTION) کو زندگی اور قوت بخشتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی میں اس وسیع نقطۂ نظر کو ایک ایسے قاعدے میں بدل دیا گیا جو بیرن پارک کے الفاظ میں "زریں اصول" تھا۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تمام قوانین و معاہدات کے الفاظ کی تعبیر لغت اور گرامر کی روشنی میں کی جانی چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں عدل، قانون اور قانون سازوں کا اصل مدعا بالکل فوت ہو جائے۔ میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جج بالکل آنکھیں بند کر لیں، ہاتھ باندھ لیں اور صورت حال کی ساری خرابی کا الزام مقننہ کے سر ڈال دیں۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ الفاظ کی غلامی میں مبتلا ہوئے بغیر عبارت کی ایسی معقول توضیح و تاویل کی جانی چاہیے جو قرین عدل و انصاف ہو۔ حق اور صداقت تک رسائی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے

**عدل و انصاف** حق پرستی اور ایفائے عہد کے بعد آئیے اب عدل و انصاف کریں۔ میرے خیال میں اس امر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کو ہمیشہ ہر معاملے میں عادلانہ اور منصفانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ہمارے

ہاں انصاف کا مفہوم بالکل وہی ہے جسے مسیحی تعلیمات میں "محبت" (LOVE) کا نام دیا گیا ہے۔ آرک بشپ آف کنٹربری ولیم ٹمپل کا بھی یہی خیال ہے اور میں انہیں موجودہ صدی کے عظیم ترین مفکرین میں شمار کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں "یہ امر مسلم ہے کہ عیسائیت میں غالب اور امتیازی عنصر "محبت" ہوتا ہے اور اجتماعی تنظیمات میں محبت کا ظہور "عدل" کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو انجیل میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ کسی فقیہ نے حضرت مسیحؑ سے پوچھا "اے میرے آقا! حیاتِ ابدی کیسے نصیب ہوتی ہے؟" آپ نے جواب دیا "کتاب میں تم نے کیا پڑھا ہے؟" اس نے جواب دیا "لکھا ہے کہ تم اپنے خداوند خدا سے دل و جان سے محبت کرو اور اپنے ہمسائے سے ایسی محبت کرو جیسی تمہیں اپنے آپ سے ہے۔" حضرت مسیحؑ نے فرمایا "تم نے ٹھیک جواب دیا ہے۔ اس پر عمل کرو اور تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔" خالق و مخلوق سے محبت کا یہ تصور بنیادی طور پر مذہبی تصور ہے اور زندگی کے اکثر معاملات میں اس کا عملی ظہور منصفانہ برتاؤ ہی کی شکل میں ہوتا ہے۔ آپ ایک مثال فرض کیجیے کہ ٹریڈ یونین اور کارخانہ داروں کا جھگڑا چل رہا ہے اور کارخانے میں ہڑتال کا سخت خطرہ ہے۔ اب ٹریڈ یونین کمیٹی کو "محبت" کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ مگر وہ کس سے محبت کرے مزدوروں سے یا کارخانہ داروں سے۔ جواب یہ ہے کہ "دونوں سے"۔ آپ پھر یہ سوال کریں گے کہ عملاً اس جواب سے کچھ رہنمائی نہیں حاصل ہو رہی کہ کس طرح کی تجاویز مانی یا منوائی جانی چاہئیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں باہمی محبت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں سے انصاف برتا جاتے اور اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ ایک انتہائی غیر جانبدار ٹربیونل تشکیل کیا جائے جس پر دونوں فریقین کو پورا پورا اعتماد ہو، ہر فریق اس کے سامنے اپنا اپنا مقدمہ پورے زور اور دلائل کے ساتھ پیش کرے اور ہر فریق اس بات کا پختہ عزم کرلے کہ فیصلہ بلا چون و چرا شرح صدر کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا۔ اس طرح سے دونوں کے ساتھ یکساں سطح پر انصاف ہوگا اور یہ ہمارے اس مذہبی اصول کے بالکل مطابق ہوگا کہ "تو اپنے ہمسائے سے ویسی ہی محبت کر جیسی تو اپنے نفس سے کرتا ہے"۔[1]

**عدالت کا فریضہ** فریقینِ تنازعہ کے بارے میں ہم نے دیکھ لیا کہ مذہب کی روشنی میں ان کا طرزِ عمل کیا ہو

[1] "عیسائیت اور نظامِ اجتماعی" (TEMPLE: CHRISTIANITY AND THE SOCIAL ORDER)

جس سے "محبت" کا تقاضا پورا ہو۔ آئیے اب دیکھیں کہ تنازعہ جس جج کے سامنے پیش ہوگا اُسے کیا کرنا چاہیے اُسے بھی انصاف سے کام لینا چاہیے۔ مگر اُسے کیسے معلوم ہوگا کہ انصاف کس شئے کا نام ہے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ایک بہت بڑے جج نے اس مسئلے کو کیسے حل کیا ہے۔ ایک مرتبہ ایک شربت ساز نے ایسی لاپرواہی سے مشروبات کو تیار اور بند کرایا کہ ایک بوتل میں جیتا جاتا گھونگا داخل کر دیا گیا۔ یہ بوتل اُس سے ایک دکاندار نے اور دکاندار سے ایک گاہک نے خریدی۔ گاہک کی بیوی نے اُسے پیا اور بیمار ہوگئی۔ پہلے زمانے میں ایسے معاملات کے بارے میں قانون کا فیصلہ یہ تھا کہ مال کا تیار کرنے والا ایسے نقصان کا ذمہ دار نہیں ہے کیونکہ آخری خریدار کے ساتھ اُس کا براہِ راست کوئی لین دین کا معاملہ نہیں ہوا۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں ہاؤس آف لارڈز نے یہ پاس کر دیا کہ صناع اس طرح کے نتائج کا ہر لحاظ سے ذمّے دار ہے۔ اس کی بنا لارڈ ایٹکن (LORD ATKIN) کا وہ فیصلہ تھا جو مسیحیت کی تعلیمات کا صحیح مظہر تھا اور جس میں انہوں نے لکھا تھا "ہم ہمسائے سے محبت کے اصول کا انطباق قانون کی دنیا میں اس طرح کرتے ہیں کہ ہمسائے کو کوئی گزند نہیں پہنچانا چاہیے۔ آپ کو پوری اور معقول احتیاط برتنی چاہیے کہ آپ کوئی ایسا کام نہ کریں یا کہنے سے باز نہ رہیں جس کے کرنے یا باز رہنے سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہو کہ آپ کے ہمسائے کو تکلیف پہنچے گی۔ اب وکیل پوچھتا ہے کہ قانون کی نگاہ میں ہمسایہ کون ہے۔ اس کا صحیح جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے وہ لوگ ہیں جو میرے فعل سے براہِ راست متاثر ہوتے ہیں اور اتنے قریب سے متاثر ہوتے ہیں کہ فعل کے صدور کے وقت ان لوگوں کے متاثر ہونے کا امکان بجا طور پر میرے ذہن میں موجود ہونا چاہیے۔ میں آپ سے عرض کروں گا کہ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے ہاں کا ایک بہت بڑا جج قانون کے اصول کو۔ نہیں، بلکہ انصاف کے اصول کو دینی تعلیمات سے اخذ کرے۔ مَیں نہیں جانتا کہ ایک جج اگر اس مأخذ اور سرچشمے کی طرف رجوع نہ کرے تو پھر اور کہاں جائے۔ بعض لوگ فطری انصاف (NATURAL JUSTICE) کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں گویا کہ یہ ایک ایسی شے ہے جسے ہر شخص آپ سے آپ جانتا ہے خواہ اُسکی پرورش اور تربیت کیسے ہی ماحول میں کیوں نہ ہوئی ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمارے اندر انصاف اور سارے اخلاقِ حسنہ کے تصورات کا نشوونما ایک لمبے تاریخی پس منظر کے تحت ہوا ہے۔ انگلستان کے قانونِ عامہ

(COMMON LAW) کو صدیوں کے تدریجی عمل کے بعد اُن ججوں نے اپنے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالا ہے جن کی تعلیم و تربیت عیسائیت کے مذہبی ماحول میں سرانجام پاتی رہی تھی۔ عدل و انصاف کے مقتضیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ ہمیشہ شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے مذہب سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

**جرائم کا سدِباب** اب آپ دیکھیے کہ جرائم کی روک تھام کے لیے کس طرح مذہب اور قانون دونوں مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہے اور مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ معاشرہ بہت حد تک وہ حالات پیدا کرتا ہے جو جرائم کے ارتکاب کا باعث بنتے ہیں۔ ہمارے ہاں گھریلو زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر چکا ہے اکثر کم سن اور نابالغ مجرمین اُجڑے ہوئے گھرانوں (BROKEN HOMES) میں سے نمودار ہو رہے ہیں ایک نوعمر انسان جب اپنے گردوپیش کے ماحول میں اپنے لیے کوئی ماویٰ و ملجا نہیں پاتا تو وہ اس بے رحم دنیا سے لڑنے کا عزم کر لیتا ہے۔ اُس کے اندر لازماً اجتماعیت کُش اور مجرمانہ ذہنیت پرورش پانے لگ جاتی ہے یہ برباد اور ویران گھرانے۔ جو کثیر تعداد میں مُجرمین فراہم کرتے ہیں، ہمارے اُس معاشرہ کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں جو رشتۂ ازدواج کا احترام کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے، جو اپنے اخلاقی اقدار و معیارات کو خیرباد کہہ رہا ہے اور جو اپنے مذہب سے قطع تعلق کر رہا ہے۔ معاشرے کی اصلاح کیے بغیر محض مجرموں کی اصلاح کے لیے کوشش کرنا مرض کو چھوڑ کر مرض کے علامات کے پیچھے پڑنا ہے۔ ہم مرض کو جڑ سے اکھیڑنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے لیے پوری سوسائٹی کی اصلاح لابدی ہے اور اس ضمن میں مذہبی اور اخلاقی مصلحین اور رہنماؤں کی ذمہ داری بہت کٹھن ہے۔ یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے سب سے اُونچے گھرانوں میں خانگی ناچاقیوں اور ازدواجی جرائم کی مثالیں روز افزوں ہیں۔

**فرد کی ذمہ داری** جرائم کی ذمہ داری اگرچہ معاشرے پر بھی عائد ہوتی ہے، لیکن نہ تو قانون کی نگاہ میں اور نہ ہی مذہب کی نگاہ میں فرد کو بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ عیسائیت کی رو سے ایک فرد بھی اپنے گناہوں کا بہت حد تک ذمہ دار ہے۔ عیسائیت ایک خطاکار کو یہ کہہ کر معاف نہیں کر دیتی کہ "جاؤ تمہارے کنبے یا تمہارے ماحول نے ایسا کرنے پر تمہیں مجبور کر دیا تھا"۔ اُس سے یہ کہنا تو اُسے یہ اطمینان دلانا ہے کہ بُرائی کی روک تھام اور اُس کے خلاف انفرادی جدوجہد بالکل غیر ممکن اور غیر ضروری ہے۔ عیسائیت کا نقطۂ نظر اس

بالکل مختلف ہے۔ وہ مجرم سے تائب و نادم ہونے اور آئندہ اصلاح کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہماری دعا کی کتاب (BOOK OF COMMON PRAYER) کا اولین فقرہ یہ ہے: "جب گناہ گار اپنے گناہ سے باز آجاتا ہے اور نیکی کا کام کرتا ہے تو وہ اپنی روح کی زندگی اور سلامتی کو محفوظ کر لیتا ہے"۔ سینٹ لیوک (ST. LUKE) نے فرمایا ہے "جب خدا ایک پشیمان خطا کار کو اپنے حضور میں دیکھتا ہے تو خوش ہوتا ہے"۔ ایک سزاوار مجرم کے اندر خیانتِ نفس (GUILTY MIND) کے احساس کا پیدا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سینٹ آگسٹائن کے بقول اس احساس کے بغیر تطہیر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہنری اول کے عہد میں تو اس بات کو بطور ایک قانونی دفعہ کے ثبت کیا گیا تھا کہ "جرم وہ ہے جس پر ضمیر ملامت کرے"۔ اگر غور و تامل سے دیکھا جائے تو آج بھی قانونی جرائم کی بنیاد یہی نظریہ ہے کہ جو فعل اخلاقی لحاظ سے قابلِ مذمت ہے قانونی لحاظ سے وہی مستوجبِ سزا و عقوبت ہے۔ گویا ایک فعل کے "جرم" ہونے کے لیے اس کا "گناہ" ہونا ضروری ہے۔

**فرد اور جماعت** اسی بحث کے دوران میں یہ بنیادی سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرد اور جماعت — شہری اور ریاست — کے باہمی تعلقات و حقوق کی تعیین کس طرح سے ہو۔ حق اور انصاف کوئی مجرد تصورات نہیں ہیں کہ ایک فکری خلا کے اندر اُن کا تصور کیا جا سکتا ہے، ان کا عملی مظاہرہ ایک جماعت یا دوسرے لفظوں میں ریاست کے وجود کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اب ریاست اور معاشرے کو ایسی بنیادوں پر بھی استوار کیا جا سکتا ہے جہاں حق اور عدل کا گلا بالکل گھونٹ دیا جائے اور صرف اس کا ذکرِ خیر ہی باقی رہ جائے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے پھر مذہب کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ مذہب کا نقطۂ نظر واضح کرنے کے لیے میں پھر ولیم ٹمپل کے الفاظ مستعار لوں گا۔ وہ فرماتے ہیں "مسیحی اخلاقیات اور مسیحی سیاست کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ ہر فرد بحیثیت فرد کے انفرادی اعزاز و احترام کا مستحق ہے۔ اگر ہر مرد اور ہر عورت خدا کی مخلوق ہے جس سے خدا محبت کرتا ہے تو معاشرے کے حق میں ایک فرد کی افادیت سے قطع نظر ہر فرد کی ایک مستقل بالذات شخصی قدر و قیمت ہے۔ فرد کا درجہ اولین ہے اور جماعت کا درجہ ثانوی۔ ریاست شہری کے لیے ہے نہ کہ شہری ریاست کے لیے"۔ عیسائیت نے ہمیشہ اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ

ریاست کو کلی، آخری اور مطلق اقتدار حاصل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اقتدار کو اللہ تعالیٰ سے اخذ کرتی ہے۔ سینٹ پال نے رومیوں کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ "اقتدار کسی کو حاصل نہیں سوائے اللہ کے۔ تمام حکمران خدا کے محکوم ہیں"۔ یہی تو وہ سپر ہے جس سے مسلح ہو کر ہمارے آباؤ اجداد نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا تھا۔ سینٹ پال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "ریاست تو نیکی کے قیام میں خدا کی نائب ہے"۔ (MNISTER OF GOOD FOR GOOD)۔ جب تک ریاست اپنی مقدس امانت کو ادا کر رہی ہے اُس کی مزاحمت جائز نہیں لیکن جب وہ حد سے تجاوز کر کے اقتدارِ مطلق (ABSOLUTE POWER) کی مدعی بنتی ہے تو اُس کی مزاحمت حق بجانب ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جن آدمیوں میں جبلّی طور پر جنسی یا بعض دوسرے وحشیانہ جرائم کے ارتکاب کا میلان ہو انہیں یا بانجھ بنا دینا چاہیے یا غیر محدود عرصے کے لیے اُنہیں محبوس کر دینا چاہیے یا قتل کر دینا چاہیے۔ لیکن ہمارے ملک میں کسی شہری سے یہ سلوک روا رکھنے کی قانوناً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مذہبی تعلیمات کا ثمرہ ہے۔ مذہب کی رُو سے آزادی، زندگی، اور زندگی کو وجود میں لانے والے توالد و تناسل کے ذرائع سب مقدس و محترم ہیں۔ یہ خدا کا عطیہ ہیں اور وہی انہیں ہمیشہ کے لیے واپس لے سکتا ہے۔ اگر ریاست کو ان عطیات پر ہاتھ ڈالنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے تو وہی کچھ ہوگا جو نازی ریاستوں نے کیا، یعنی انہوں نے اپنے سیاسی مخالفین پر یہ حربے آزمانے شروع کر دیے۔ میرے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل سوائے اس کے نہیں ہے کہ ہم مذہب سے رجوع کریں۔ وہی ہمیں بتائے گا کہ شہری اور ریاست کے حقوق میں توازن کی معتدل صورت کونسی ہے۔

ایک تاریخی واقعہ | جیمز اول (JAMES 1) کے عہد میں ایک مشہور و معروف واقعہ پیش آیا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ کی طرح انگلستان میں حکومت کر سکتا ہے اور عدالتوں میں استغاثہ و مرافعہ کے بغیر وہ ہر معاملے میں آخری فیصلہ دے سکتا ہے۔ آرک بشپ بین کرافٹ (BANCROFT) نے بھی بادشاہ کی تائید کی۔ لیکن اُس زمانے میں ایک بہت بڑے لارڈ چیف جسٹس تھے جن کا نام تھا لارڈ کوک (LORD COKE) وہ اپنے دن کا ایک چوتھائی حصہ عبادت میں بسر کیا کرتے تھے (اور ان کی کثیر

مصروفیتوں کے ساتھ تعجب ہوتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر لیتے تھے)۔ انہوں نے بادشاہ سے کہا تمہیں فیصلے چکانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمام مقدمات عدالت میں جانے چاہئیں۔" بادشاہ نے کہا "میں نے تو یہ سُن رکھا ہے کہ تمہارے قوانین کی بنا عقل پر رکھی گئی ہے، تو کیا مجھ میں ججوں سے بھی کم تر عقل ہے؟" چیف جسٹس نے جواب دیا "آپ بلاشبہ بہت علم و صلاحیت کے مالک ہیں لیکن قانون کے لیے بڑے تجربے اور مطالعے کی ضرورت ہے یہ تو ایک سنہری پیمانہ ہے جس سے رعایا کے حقوق کی پیمائش کی جاتی ہے اور خود حضور والا کی حفاظت کی جاتی ہے" بادشاہ نے انتہائی غضبناک ہو کر کہا "کیا میں بھی قانون کے ماتحت ہوں، ایسا کہنا تو غداری ہے۔" لارڈ کوک نے برکٹین کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "بادشاہ کسی آدمی کا محکوم نہیں، مگر وہ خدا اور قانون کا محکوم ہے۔"

دستور کا سنگِ بنیاد | برکٹین (BRACTON) کے جو الفاظ ہمارے قاضی القضاۃ لارڈ کوک نے نقل کیے تھے۔ یہ درحقیقت ہمارے دستور کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں۔" خدا اور قانون سے بادشاہ کے بالاتر نہ ہونے" کا مطلب یہ ہے کہ انتظامیہ (EXECUTIVE) قانون کے ماتحت ہے۔ ہمارے قانون دان جب یہ دستوری کلیہ بیان کرتے تھے تو وہ دراصل اپنا ایک مذہبی عقیدہ دہرا رہے ہوتے تھے۔ اگر ہم اس عقیدے کو فراموش کر بیٹھیں تو ہمارا انجام کیا ہوگا اور اس خود فراموشی کی زد کہاں کہاں جا کر پڑے گی۔ اس کے دُور رس نتائج و عواقب کا مشاہدہ کرنے کے لیے آپ ایک نظر اٹھا کر دنیا کی آمرانہ ریاستوں کو دیکھ لیں۔ وہاں ریاست کو فرد پر مقدم قرار دے کر فرد کے وجود کو ریاست میں گُم کر دیا گیا ہے۔ وہاں شہری ریاست کے لیے زندہ ہے نہ کہ ریاست شہری کے لیے۔ وہاں کے حکمران "خدا اور قانون کے تابع" نہیں ہیں۔ وہ خود ہی خدا اور خود ہی قانون ہیں۔ تمام قوانین اور تمام عدالتیں انتظامی مشینری کے ہی کل پرزے ہیں۔ ان کا کوئی مستقل اور آزادانہ وجود نہیں ہے۔ فرد کی آزادی کی حقیقت خواب و خیال سے بھی کم تر ہے۔ ایسی ہولناک مطلق العنانی اور استبداد کے خلاف، اور حیاتِ انسانی پر ایسے مہیب آہنی تسلط کے خلاف، ہمارا مذہب پُورے زور اور پُوری قوت کے ساتھ احتجاج کرتا ہے!

اب میں اپنی بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیجیے کہ بحث کسی نتیجے پر پہنچ کر ختم ہو رہی ہے۔ بلاشبہ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم حق اور عدل کے متلاشی ہیں تو ہم اسے بحث مباحثوں اور مناظروں کے ذریعے سے، مطالعے اور غور و فکر کے ذریعے سے دریافت نہیں کر سکتے۔ صداقت اور انصاف تک رسائی نیکوکاری اور بندگی

(باقی صفحہ آئندہ کے نیچے)

# اسلام اور ہمارا قانونی نظام

(عبدالقادر عودہ شہید)

(۴)

اسلام میں ذلت گوارا نہیں | اسلام کبھی اسے پسند نہیں کرتا کہ مسلمان دب کر رہیں۔ ایک مسلمان نرمی اور عاجزی صرف اپنے مسلمان بھائی کے بالمقابل ہی اختیار کر سکتا ہے۔ اسلام کے دشمنوں کے لیے وہ نرم چارا نہیں ہے۔

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (المائدہ) — مومنین کے مقابلے میں نرم ہیں، کافروں کے بالمقابل سخت ہیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (الفتح) — محمد، اللہ کے رسول، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔

حقیقت میں مسلمانوں کا مقام دنیا میں ذلت کا نہیں، بلکہ عزت اور غلبے کا ہے:۔

وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ — اور اللہ کے لیے ہے عزت اور اس کے رسول کے لیے اور

---

## (بقیہ مذہب اور قانون کا باہمی رشتہ)

کی وساطت ہی سے ہو سکتی ہے۔ سچائی اور انصاف کی پہچان روح کو ہے اور روح کو زندگی اور جلا مذہب کے طفیل ہی ملتی ہے۔ قانون تو سچائی اور انصاف کو نافذ اور منطبق کرنے کا محض ایک ناقص اور ادھورا وسیلہ ہے جس کا ظہور صرف خارجی یعنی دین اور ظاہر کے معاملات میں ہوتا ہے۔ جس دن روئے زمین پر سے مذہب کا خاتمہ ہو جائے گا، اُسی دن زمین پر سے سچائی اور عدل کا بھی جنازہ اُٹھ جائے گا۔ اپنے آبا و اجداد کے مذہب سے دُور ہوئے اور دُور رہے ہم پر بڑے زمانے دراز گزر چکے ہیں۔ آئیے ہم اس کی طرف لوٹیں کیونکہ یہی اور صرف یہی ایک شے ہے جو ہمیں بچا سکتی ہے!!!

الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (المنافقون) مومنین کے لیے لیکن منافقین جانتے نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اپنے اس مقام عزت پر یقین و اعتقاد رکھیں اور اس امر کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں کہ وہ اللہ کے وعدے کو سچا ثابت کر دکھائیں گے اور اپنی امت کو اس مقام پر فائز کریں گے جو اللہ نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ مقام درحقیقت دنیا کی تعلیم و ہدایت اور امامت و قیادت کا مقام ہے۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ (البقرہ: ۱۴۳) اسی طرح بنایا ہے ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت تاکہ تم بنو گواہ تمام لوگوں پر۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰) تم ایک بہترین امت ہو جو تشکیل کی گئی ہے تمام لوگوں کے لیے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔

**ہجرت** اسی تعلیم کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان سے یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ جس سرزمین میں اُسے عزت اور سرفرازی کا مقام حاصل نہ ہو اور نہ ہی وہاں ایسے اسباب مہیا ہو سکتے ہوں جن سے مسلمان کو عزت و تمکین حاصل ہو سکتی ہو، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی سرزمین کی جانب ہجرت اختیار کرے جہاں ایسے اسباب فراہم ہوں یا فراہم ہو سکنے کی توقع ہو۔ ایسے شخص کے لیے اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ اُسے زمین میں قرار اور ٹھکانا نصیب ہو گا۔ اور اگر اس کی تلاش میں اُس کی زندگی ختم ہو جائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ہاں ضائع نہ ہو گا۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (النساء: ۱۰۰) اور جو ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں، پائیگا زمین میں ٹھکانا بہت اور فراخی اور جو کوئی نکلے اپنے گھر سے مہاجر بن کر اللہ اور اُس کے رسول کی جانب پھر آلے اُسے موت پس ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ پر۔

اگر ایک مسلمان ذلت اور ضعف پر راضی اور قانع ہو جائے، حالانکہ وہ ہجرت کی قدرت رکھتا ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں ہے، اسلام کا دعویٰ اُس کے کسی کام نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے

ذلت و مسکنت کے طوق کو خود گلے میں ڈالا ہے۔ اسلام نے اُسے ہرگز اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس خواری اور رسوائی میں مبتلا رہے۔ اسلام نے مسلمان کو حتی الوسع غیر مسلموں کے معاشرے میں رہنے سے منع کیا ہے کیونکہ یہ کمزوری کی علامت ہے اور ایسی حالت میں مسلمان کو غیر مسلموں کا تابع بن کر رہنا پڑتا ہے۔ حالانکہ مسلمان سوائے اللہ کے کسی کا تابع نہیں ہو سکتا۔

قرآن کا ارشاد ہے:۔

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِىٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِى الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ۝ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝

(النساء - ۹۷)

وہ لوگ جن کی روح قبض کر رہے تھے فرشتے جبکہ وہ ظلم کرنے والے تھے اپنی جانوں پر، کہا فرشتوں نے کس حال میں تھے تم۔ کہا انہوں نے، تھے ہم کمزور بنا دیئے گئے زمین میں۔ انہوں نے کہا کیا نہیں تھی زمین اللہ کی وسیع کہ تم ہجرت کر جاتے اس میں"۔ پس یہی لوگ ہیں ٹھکانا ہے ان کا جہنم اور برا ٹھکانا ہے۔ مگر وہ لوگ جو کمزور رہے ہوں مردوں عورتوں اور بچوں میں سے کہ نہ تو چارہ کار رکھتے ہوں اور نہ راہ پاتے ہوں، پس قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے درگزر فرمائے اور اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

انا بریٔ من کل مسلم یقیم بین اظہر المشرکین، قیل یا رسول اللہ ولم؟ قال لاتراءی ناراھما۔

میں بری الذمہ ہوں ہر اس مسلمان سے جو مشرکین کے اندر مقیم رہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ ایسا کس لیے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اُن کے چولھے آمنے سامنے نہیں ہونے چاہئیں، ان کی معاشرت اور رہن سہن بالکل الگ ہونا چاہیے۔

من جامع المشرك وسكن معه فهو مثله۔

جس شخص کی آمد و رفت اور سکونت مشرک کے ساتھ رہی، وہ اسی کی مانند ہے۔

لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس فی مغربها۔

ہجرت ختم نہیں ہوگی جب تک توبہ نہ ختم ہو اور توبہ نہیں ختم ہوگی جب تک سورج مغرب سے نہ نکلے۔

**اسلام ظلم سے مصالحت نہیں کرتا** اسلام اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ ظالم اور زیادتی کرنے والے کے مقابل میں خاموش رہا جائے اور برائی کے سامنے سر جھکا دیا جائے۔ اسلام ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ ہم اقوام یورپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں اور جو مظالم وہ اسلامی ممالک پر ڈھا رہے ہیں ہم اُسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں۔ ضروری ہے کہ طاقت کا جواب طاقت سے دیا جائے، تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا جائے۔ حتیٰ کہ ہمارے غصب کردہ حقوق ہمیں واپس مل جائیں، ہمارے دشمن ناکام و نامراد ہو کر رہ جائیں، اور ہمارے ممالک میں اقتدار خالص اسلام اور مسلمانوں کے قبضے میں آجائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۔ (البقرہ، ۱۹۴)

ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام ہے اور حرمتوں میں بدلہ ہے پس جو کوئی زیادتی کرے تم پر، تم زیادتی کرو اس پر اتنی جتنی زیادتی کی ہے اُس نے تم پر۔

جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ: ۴۰)

برائی کا بدلہ برائی ہے اتنی ہی۔

**جہاد فرض ہے** اسلام کے دشمنوں سے جہاد اللہ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے اور جہاد میں ہر طرح کی مالی اور جانی قربانی اور جدوجہد شامل ہے، قرآن میں جہاد پر بار بار زور دیا گیا ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ، ۲۱۶)

تم پر فرض کیا گیا ہے لڑنا اور وہ ناپسند ہے تمہیں اور شاید کہ تم ناپسند کرو ایک چیز کو اور وہ بہتر ہو تمہارے لیے۔

وَقَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ۔

اور لڑو اللہ کی راہ میں اُن سے جو لڑتے ہیں تم سے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال: ۳۹)

اور جنگ کرو اُن سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ اور ہو جائے دین سارے کا سارا اللہ کے لیے

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ

اور قتل کرو انہیں جہاں پاؤ تم انہیں اور نکالو انہیں جہاں سے

مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (البقرہ: ١٩١)

انہوں نے نکالا ہے تمہیں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (النساء: ٧٤)

پس لڑنا چاہیے اللہ کی راہ میں اُن لوگوں کو جو بیچتے ہیں دنیا کی زندگی کو آخرت کے عوض۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ (النساء: ٧٥)

اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ نہیں لڑتے تم اللہ کی راہ میں اور کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ۔ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ (النساء: ٧٦)

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو لوگ کافر ہوئے ہیں لڑتے ہیں طاغوت کی راہ میں پس جنگ کرو شیطان کے دوستوں سے۔ یقیناً شیطان کی چال ضعیف ہوتی ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (التوبہ: ٤١)

نکلو ہلکے پھلکے اور ساز و سامان سے لیس اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کے رستے میں۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً۔ (التوبہ: ٣٦)

اور سارے کے سارے قتال کرو مشرکین سے جس طرح وہ قتال کرتے ہیں تم سے سارے کے سارے۔

وَقَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (التوبہ: ٢٩)

لڑو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یوم آخر پر اور نہیں حرام سمجھتے اُسے جسے حرام کیا ہے اللہ اور اس کے رسول نے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (الصف: ٢)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت جو نجات دے تم کو دردناک عذاب سے۔ تم ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

فقہاء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جہاد کن حالات میں فرض عین ہے اور کن حالات میں فرض کفایہ ہے لیکن مندرجہ ذیل صورتوں میں جہاد بالاتفاق فرض عین ہے :-

(۱) جب لشکرِ اسلام اور لشکرِ کفار میدانِ جنگ میں باقاعدہ مورچہ بند ہو کر لڑیں، تو ایسی لڑائی میں آخر دم تک لڑنا فرضِ عین ہے، اور سپہ سالار کی اجازت کے بغیر پیٹھ پھیرنا حرام ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا (الانفال: ۴۵)

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو جب کسی لشکر سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو تو ڈٹ جاؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ (انفال: ۱۵)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم مقابلہ کرو ان لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا ہے مورچہ جما کر اور صفیں باندھ کر، تو پھر پیٹھ مت موڑو۔

(۲) جب امام مسلمین کی طرف سے نفیر عام ہو جائے یعنی ہر قابل جنگ مرد کو لڑنے کی دعوت دیدی جائے تو ایسی صورت میں بھی جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ۔ (التوبہ: ۳۸)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے نکلو اللہ کی راہ میں، تو تم زمین کے ساتھ لگے جا رہے ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

اذا استنفرتم فانفروا

جب تمہیں نکلنے کے لیے کہا جائے تو نکلو۔

(۳) جب کفار کسی اسلامی ملک میں داخل ہو جائیں تو وہاں کے تمام باشندوں پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے، کیونکہ قرآن میں ہے : وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ۔ اور اس سے بڑھ کر اور فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ بلادِ اسلامیہ کفار کے زیرِ تسلط ہوں۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کفار دارالاسلام کی کسی غیر آباد اور ویران جگہ پر بھی قابض ہوں تب بھی اُن کے خلاف جہاد فرض ہے۔ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ کفار کے ملک کے اندر گھس آنے پر بوڑھوں، عورتوں، مریضوں اور معذوروں پر بھی جہاد فرض ہو جاتا ہے، حالانکہ بالعموم عورتوں کو اس

خدمت سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ کیا عورتوں پر بھی جہاد فرض ہے۔ تو آپؐ نے فرمایا تھا "جهاد لا قتال فيه الحج والعمرة" (عورتوں کے لیے ایسا جہاد ہے جس میں قتال نہیں ہے، یعنی حج اور عمرہ)۔

جہاد کے لیے دائمی تیاری | مسلمانوں پر صرف یہی فرض نہیں ہے کہ وہ جنگ کی پکار پر لبیک کہیں اور موقع آنے پر قدم پیچھے نہ ہٹائیں، بلکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر وقت جہاد کے لیے آمادہ رہیں، کیل کانٹے سے لیس رہیں اور فوجی طاقت اس حد تک فراہم کر رکھیں کہ دشمن مرعوب رہے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کا خیال بھی اُس کے دل میں نہ آنے پائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوا ثُبَاتٍ أَوِ انْفِرُوا جَمِيعًا - (النساء - ۷۱)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے بچاؤ کا سامان کر رکھو، پھر نکلو گروہ در گروہ یا نکلو سب کے سب۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ۔ (الانفال: ۶۰)

اور تیار کر رکھو جتنا تم کر سکتے ہو طاقت میں سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں میں سے جن سے تم ڈراؤ گے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں کو جنہیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ جانتا ہے ان کو۔

اس لحاظ سے ہر وہ ساز و سامان اور ہر وہ تدبیر مسلمانوں کے لیے ضروری ہے جو ہماری جنگی قوت و مہارت میں اضافہ کرے۔ جنگی تربیت، تیر، لاٹھی، تلوار، اور آتشیں اسلحہ جات کا استعمال، جنگی گاڑیوں، ٹینکوں، ہوائی اور بحری جہازوں کو چلانا سب اسی ضمن میں آتا ہے۔ کشتی، تیراکی اور شہسواری وغیرہ بھی اسی کے تحت آتی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسلحہ سازی اور سامانِ حرب کی صناعت کا کام بھی مسلمان خود سرانجام دیں۔

رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الا ان القوة الرمى الا ان القوة الرمى

جان لو کہ "قوت" (جس کے پیدا کرنے کا قرآن میں حکم ہے) تیر اندازی اور نشانہ بازی ہے۔

المسلم القوى خير واحب الى الله من المسلم

طاقتور مسلم اللہ کے نزدیک

الضعيف۔ ان الله يدخل بالسهم الواحد ثلاثة في الجنة، صانعه يحتسب في صنعه الخير، والرامي به، ومنبله

زیادہ اچھا اور پسندیدہ ہے بہ نسبت کمزور مسلم کے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ایک تیر کے طفیل تین کو جنت میں، اُس کے بنانے والے کو جو خیر کی نیت سے اسے بناتا ہے، اس کے استعمال کرنے والے کو اور استعمال کے لیے دینے والے کو۔

ارموا واركبوا وان ترموا احب الي من ان تركبوا، مَنْ عَلِمَ الرمي ثم تركه فليس منا

نشانہ بازی اور شہسواری سیکھو اور مجھے تمہاری نشانہ بازی سواری سے زیادہ پسند ہے۔ جس نے تیر اندازی سیکھ کر اُسے ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ستُفتح عليكم ارضون ويكفيكم الله فلا يعجز احدكم ان يلهو بسهمه۔

تم کئی ممالک کو فتح کرو گے اور اللہ تمہارے لیے کافی ہوگا پس تیر اندازی نہ چھوڑنا۔

عملاً بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ پیدل دوڑوں اور اونٹوں گھوڑوں کی دوڑوں میں شریک ہوتے، اپنے سامنے ان کے مقابلے کرائے اور ایسے مشاغل کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ ایک مرتبہ تیر اندازی کے ایک مقابلے میں آپ ایک فریق میں شامل ہوئے تو دوسرے فریق نے عرض کیا، ہم اُس گروہ پر کیسے تیر چلائیں جس میں آپ ہیں؟ آپ نے فرمایا

ارموا وانا معكم كلكم

تم تیر چلاؤ میں تم سب کے ساتھ ہوں۔

آپ کے عمل سے کشتی اور تیر اندازی بھی ثابت ہے۔

**اجرِ جہاد** | اسلام میں جہاد فی سبیل اللہ کے عوض میں اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے "اسلام کی چوٹی" قرار دیا ہے۔ اجرِ جہاد سے متعلق آیاتِ قرآنی میں سے چند آیات یہ ہیں:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ۔ (البقرہ: ۲۱۸)

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے ہجرت اور جہاد کیا ہے اللہ کی راہ میں یہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا

وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے ہجرت اور جہاد کیا

فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللّٰهِ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ
(التوبہ - ۲۰)

اللہ کے رستے میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے بہت بڑھ کر ہیں درجے میں اللہ کے ہاں اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔

لَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ۔
(آل عمران - ۱۵۷)

اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں یا مر گئے، تو مغفرت اللہ کی طرف سے اور رحمت بہتر ہے اُس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ۔
(آل عمران - ۱۶۹)

مت سمجھو تم اُن لوگوں کو جو قتل ہوئے اللہ کی راہ میں مُردہ، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ۔ (آل عمران - ۱۹۵)

پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جو نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے، میں ضرور اُن کی برائیاں دُور کر دونگا اور ضرور داخل کرونگا انہیں باغات میں، جاری ہیں جن کے نیچے نہریں بطورِ اجر اللہ کی طرف سے اور اللہ کے پاس بہت اچھا بدلہ۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔ (التوبہ - ۱۱۱)

اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے اُن کی جانوں اور مالوں کو اس کے عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے۔ وہ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، پس مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاءُ۔ (البقرہ - ۲۶۱)

مثال اُن لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ایسی مثال ہے جیسے ایک دانہ ہو جس سے سات خوشے اُگیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور اللہ دو چند کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

| | |
|---|---|
| الا اخبرکم بخیر الناس قالوا بلی یارسول اللہ قال رجل یمسک براس فرسہ فی سبیل اللہ حتیٰ یموت او یقتل ۔ | کیا نہیں سب سے بہتر انسان کی خبر نہ دوں صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ۔ آپ نے فرمایا، وہ انسان جو اپنے گھوڑے کو تھامے رہے یہاں تک کہ وہ مر نہ جائے یا مارا نہ جائے ۔ |
| رباط یوم فی سبیل اللہ خیر من الف یوم فیما سواہ من المنازل ۔ | اللہ کی راہ میں ایک دن کا پہرہ دوسری منازل کے ایک ہزار دن سے بہتر ہے ۔ |

**۱۹۳۶ء کا معاہدہ** مصر ۱۹۱۹ء سے اپنی آزادی کے لیے کوشاں ہے۔ سولہ سال تک انگریزوں سے بھیک مانگتے رہنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں انگریز از راہ نوازش ایک معاہدہ کرنے پر آمادہ ہوئے جسے معاہدۂ شرف و استقلال کا نام دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سادہ لوحی اور دریوزہ گری کا بدترین مظاہرہ ہے۔ اس معاہدے کی رو سے دراصل ہم نے تسلیم کر لیا ہے کہ ہماری آزادی کے پاسبان اور اجارہ دار انگریز ہیں۔ بعد کے تجربے نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ یہ معاہدہ ایک سراب اور اسم بے مسمّٰی سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اس معاہدے میں جو جو شرائط ہمارے حق میں کچھ بھی مفید ہو سکتی تھیں انگریزوں نے انہیں ایک ایک کر کے توڑا ہے۔ مثلاً اس میں ایک شرط یہ تھی کہ انگریز ہمارے داخلی معاملات میں دخل نہیں دیں گے۔ اس شرط کی خلاف ورزی کی نمایاں ترین مثال یہ ہے کہ ۴ر فروری ۱۹۴۲ء میں انگریزوں نے حکومت مصر سے الاخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ اگر ایک فریق کی کسی ملک سے جنگ ہو تو دوسرا اس کی مدد کرے گا۔ ہم نے انہیں جنگ میں ہر طرح کی امداد دی مگر جب یہودیوں سے ہماری لڑائی کی نوبت آئی تو انگریزوں نے وعدہ کر لینے کے باوجود اسلحہ قیمتاً دینے سے بھی انکار کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں مصریوں کے اندر انگریزوں کے خلاف شدید جذبات مشتعل ہو چکے تھے اور مصر میں انگریزی اثر و نفوذ کا خاتمہ بالکل قریب نظر آ رہا تھا۔ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ الاخوان کا تھا۔ انگریزوں نے دوبارہ حکومت مصر کو ان کے خلاف اٹھایا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ حکومت دشمن کے خلاف زور آزمائی کرتی، انہیں چھوڑ کر

اس نے اپنے بھائیوں کو ظلم و ستم اور تعذیب کا نشانہ بنایا انہیں جیلوں میں ٹھونسا گیا اور ان کی جان، مال اور آبرو پر ایسے ایسے وحشیانہ حملے کیے گئے کہ انسان ان کا تصور کرتے ہوئے بھی لرز جاتا ہے۔

اعدائے اسلام سے موالات حرام ہے | غیر مسلموں سے دوستی اور بھائی چارہ ازروئے اسلام حرام ہے۔ ایک مسلمان کا عمل ہمیشہ خالص اسلام اور مسلمین کے مفاد کی خاطر ہونا چاہیے اور اس سے کفار کی خیر سگالی ہرگز مقصود نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام کا قاعدہ یہ ہے کہ مسلمان کا دوست اور ہمدم مسلمان ہے، اور کافر کا کافر۔ تمام دنیا کے مسلمان ایک امت اور ایک قوم ہیں اور تمام دنیا کے کفار ملت واحدہ ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (المومنون ۵۲) — اور یہ کہ تمہاری یہ امت ایک ہی قوم ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات - ۱۰) — مومنین تو ایک برادری ہیں۔

اسلام نے غیر مسلموں سے دوستی اس لیے منع فرمائی ہے کہ اس سے مسلمانوں کی صفوں میں سخت انتشار اور فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ اسلام اُن غیر مسلموں سے تو حسن سلوک اور ربط و ضبط کی اجازت دیتا ہے جنہوں نے مسلمانوں سے لڑائی یا اُن پر کوئی زیادتی نہ کی ہو لیکن جن کفار نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو اور ظلم و عدوان سے کام لیا ہو ان سے مودت و محبت اور میل جول رکھنے کی ممانعت ہے۔ قرآن میں یہ مضمون نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۔ (آل عمران - ۲۸) — مت بنائیں مومنین کافروں کو دوست، مومنوں کو چھوڑ کر۔ اور جو ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچ کر رہو

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۔ (التوبہ - ۷۱) — اور مومن مرد اور مومن عورتیں اُن میں سے بعض، بعض کے ملی ہیں۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۔ (الانفال) — اور وہ لوگ جو کافر ہوئے وہ ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (المائدہ - ۵۱) — اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست، اُن کے بعض بعض کے دوست ہیں اور جو اُن سے دوستی رکھے تم میں سے پس وہ انہی میں سے ہے۔

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ (المائدہ - ۵۵)

تمہارا ساتھی تو اللہ اور اس کا رسول ہے۔

الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا۔ (النساء - ۱۳۹)

جو لوگ بناتے ہیں کافروں کو رفیق مومنوں کو چھوڑ کر، کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے ہاں عزت پس یقیناً عزت اللہ کے لیے ہے ساری کی ساری۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ۔ (الممتحنہ - ۱)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ساتھی تم اظہار کرتے ہو ان کی طرف محبت کا حالانکہ انہوں نے کفر کیا ہے اُس کا جو آیا ہے تمہارے پاس حق میں سے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ (آل عمران - ۱۱۸)

اُے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ ہمراز اپنے سوا دوسروں کو۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ۔ (المجادلہ - ۲۲)

تم نہیں پاؤ گے کسی گروہ کو جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور یوم آخرت پر کہ وہ محبت کرتا ہو اُس سے جس نے مخالفت کی ہے اللہ اور اُس کے رسول کی خواہ وہ ان کے باپ ہوں، ان کے بیٹے ہوں، ان کے بھائی ہوں یا اُن کے خاندان والے ہوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ۔ (التوبہ - ۲۳)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو ساتھی اگر انہوں نے پسند کیا ہے کفر کو ایمان کے بدلے۔

تَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ وَلَوْ

تم دیکھتے ہو بہت سے ان میں سے محبت کرتے ہیں ان لوگوں سے جو کافر ہوئے اور بہت برا ہے جو آگے بھیجا ہے اُن کے لیے اُن کی جانوں نے، یہ کہ ناراض ہوا اللہ اُن پر اور

# رسائل و مسائل

## احادیثِ دجّال

سوال :- آپ نے تفہیمات حصہ اول صفحہ ۲۲۱ پر سورۂ نجم کی ابتدائی آیات مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ

---

## (بقیہ اسلام اور ہمارا قانونی نظام)

کَانُوا یُؤْمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالنَّبِیِّ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَا اتَّخَذُوْھُمْ اَوْلِیَاءَ وَلٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ فَاسِقُوْنَ (المائدہ ۸۰-۸۱)

عذاب میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور اگر ایمان لاتے ہوتے اللہ پر، نبی پر اور اس پر جو اتارا گیا ہے اس کی طرف، نہ پکڑتے انہیں دوست اور لیکن ان میں سے بہت سے فاسق ہیں۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ـ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظَاھَرُوْا عَلٰی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔

نہیں منع کرتا تمہیں اللہ اُن لوگوں سے کہ نہیں لڑے وہ تم سے دین کے بارے میں اور نہیں نکالا انہوں نے تمہیں اپنے گھروں سے کہ تم اُن سے حسن سلوک کرو اور عدل کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ منع تو کرتا ہے اللہ تمہیں ان لوگوں سے جنہوں نے جنگ کی ہے تم سے دین کے معاملے میں اور نکالا ہے تمہیں تمہارے گھروں سے اور مدد کی ہے تمہارے اخراج پر، کہ تم اُن سے دوستی جوڑو اور جو انہیں رفیق بناتے وہی لوگ ظالم ہیں۔

اِن نصوصِ صریحہ کے باوجود اور ان احکامِ قطعیہ کے علی الرغم ہمارے حکام اور زعماء انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکنوں روسیوں اور دوسرے اعدائے اسلام سے دوستی کا دم بھرتے ہیں اور ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ مسلمانوں سے لڑتے ہیں، بلادِ اسلامیہ پر بجبر مسلط ہیں اور ان پر انواع و اقسام کے مظالم ڈھا رہے ہیں۔ ہمارے حکمران ان لوگوں کی خوشامد میں عزّ و جاہ کی تلاش کرتے ہیں حالانکہ ان لوگوں کے ہاتھ مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔

وَمَا غَوٰی - وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْھَوٰی - اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:-

"ان آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر نطقِ رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ ہر وہ بات جس پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے آیاتِ مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی"

پھر رسائل و مسائل صفحہ ۵۵ پر دجال کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا ہے:-

" دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضور کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم ملا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے اور اس کی یہ اور یہ صفات ہونگی اور وہ ان ان خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا کہاں ظاہر ہوگا اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعید زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظہورِ دجال اور صفات و خصوصیاتِ دجال کے متعلق حضور کے جو ارشادات ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ وہ علم وحی پر مبنی ہیں۔ بخلاف اس کے ظہورِ دجال کے زمانہ و مقام کے بارے میں روایات باہم متعارض ہیں جن میں تطبیق کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ علم وحی پر مبنی نہیں ہیں"

اسی سلسلے میں آگے چل کر آپ فرماتے ہیں۔

" یہ تو دُّ و اول تو خود ظاہر کرتا ہے کہ یہ باتیں آپ نے علم وحی کی بنا پر نہیں فرمائی تھیں بلکہ اپنے گمان کی بنا پر فرمائی تھیں"

آپ کی مندرجۂ بالا تحریروں سے صاف واضح ہے کہ یہ باہم متناقض ہیں۔ پہلی تحریر میں تو آپ نے فرمایا ہے کہ ہر وہ بات جس پر نطق رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے علمِ وحی پر مبنی ہوگی۔ لیکن دوسری تحریر میں آپ بتاتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات ایسے بھی ہیں جو علم وحی پر مبنی نہیں ہیں۔ مثلاً ظہورِ دجال کے زمانہ و مقام کے بارے میں آپ کے ارشادات جافلکہ

ان ارشادات پر نطقِ رسول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

نیز مندرجہ ذیل سوالات بھی جواب طلب ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن ارشادات کی تائید قرآن میں موجود نہیں ان کے بارے میں یہ فیصلہ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ علم وحی پر مبنی ہیں یا نہیں۔ اگر آپ کا یہ جواب ہو، جیسا کہ آپ کی مندرجہ بالا تحریر سے ظاہر ہے کہ جو ارشاداتِ نبوی باہم متعارض نہیں ہیں وہ مبنی بر علم وحی ہیں اور جو باہم متعارض ہیں وہ مبنی بر علم وحی نہیں ہیں تو پھر سوال یہ ہے کہ کتب احادیث میں ایسی کئی متعارض احادیث ہیں جن کے بارے میں ائمہ امت کا عقیدہ ہے کہ وہ علم وحی پر مبنی ہیں اور جن سے انہوں نے مسائل کا استنباط بھی کیا ہے۔ ان کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے؟

(۲) آپ کا یہ قول کہ "آپ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کا گمان وہ چیز نہیں جس کے صحیح نہ ثابت ہونے سے آپ کی نبوت پر حرف آتا ہو" میرے نزدیک قابل قبول نہیں۔ کیونکہ غلط گمانوں میں الجھنا ایک فلسفی کا کام تو ہو سکتا ہے لیکن نبی کا منصب اس سے بدرجہا اعلیٰ، بلند اور پاک ہے۔ اگر ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فلاں گمان غلط تھا تو گویا ہم نے مان لیا کہ آپؐ فلاں موقع پر ہدایت خداوندی حاصل نہ کر کے گمراہ ہو گئے۔ اور لہٰذا آپ صلعم آیت ما ضلّ صاحبکم وما غویٰ کے صحیح مصداق نہیں تھے۔

ازراہِ کرم ان سوالات کا جواب ترجمان القرآن میں شائع کر دیں تاکہ قارئین بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

جواب:- میں نے آیت وما ینطق عن الھویٰ کا جو مفہوم تفہیمات حصہ اول میں بیان کیا ہے اس کی پوری تفصیل آپ نے دیکھنے کی زحمت نہیں اٹھائی اور صرف ایک فقرے پر اکتفا فرما لیا۔ اسی وجہ سے آپ کو اُس میں اور میری بعد کی ایک تحریر میں تناقض محسوس ہوا۔ براہ کرم اسی کتاب کے صفحات ۸۵ تا ۸۹-۲۲۰ تا ۲۲۲-۲۳۸ تا ۲۴۰-۲۴۴- اور ۲۵۸ تا ۲۵۹ بغور ملاحظہ فرما لیجیے۔ آپ کے سامنے میرا پورا مدعا آجائیگا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میرے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال

میں وحی خفی کی کارفرمائی کس معنی میں تھی اور یہ بھی کہ حضورؐ کی بعض باتوں کے وحی پر مبنی ہونے اور بعض کے نہ ہونے کا مطلب کیا ہے۔

اس کے بعد ضرورت تو نہیں رہتی کہ آپ کے اُن سوالات کا جواب دیا جائے جو آپ نے آخر میں کیے ہیں، لیکن میں صرف اس لیے ان کا جواب حاضر کیے دیتا ہوں کہ پھر کوئی الجھن باقی نہ رہ جائے۔

(۱) مَیں نے اپنی تحریر میں یہ کہیں نہیں کہا کہ ارشاداتِ نبوی کے مبنی بر وحی ہونے یا نہ ہونے کے لیے تعارض کا عدم اور وجود کوئی واحد یا حتمی قرینہ ہے، اور نہ میری تحریر کا منشا یہ ہے کہ جن اقوالِ مبارکہ میں کسی طرح کا تعارض یا اختلاف نظر آئے میں اُن کے مبنی بر وحی ہونے کا انکار کرتا ہوں۔ بعض اوقات ایسے ارشادات میں بھی بظاہر اختلاف نظر آتا ہے جن کا دیگر قرائن کی بنا پر مبنی بر وحی ہونا واضح ہوتا ہے مگر ایسی صورت میں اختلاف کو تاویل و تطبیق سے بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے یا ان میں سے ایک کا ناسخ اور دوسرے کا منسوخ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بعض روایات میں تعارض کا وجود مطلقاً نہ ہو مگر دوسرے قرائن ان کا علی سبیل الرائے ہونا بالکل واضح کر دیں۔ مَیں نے جو بات کہی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ مبنی بر وحی ارشادات ناقابلِ توجیہ تعارض سے پاک ہوتے ہیں اور جو ارشادات وحی پر مبنی نہیں ہوتے اُن میں منجملہ دیگر قرائن کے بعض اوقات ایک قرینہ تعارض کا بھی پایا جاتا ہے۔

(۲) یہ امر کہ حضورؐ کی کون سی بات ظن یا ذاتی رائے پر مبنی ہے اور کونسی اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم پر، اس کا اظہار بسا اوقات حضورؐ کی اپنی تصریحات سے ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات دوسرے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً یہی احادیث جو دجال کے متعلق وارد ہوئی ہیں، ان میں یہ بات حضورؐ کی اپنی ہی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے کہ آپ کو اُس کے مقام، زمانے اور شخصیت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم نہیں دیا گیا تھا۔ ابن صیاد کے متعلق آپ کو اتنا قوی شبہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے آپ کی موجودگی میں قسم کھا کر اسے دجّال قرار دیا اور آپ نے اس کی تردید نہ کی، مگر جب انہوں نے اس کے قتل کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا ان یکنہٗ فلن تسلط علیہ وان لم یکنہ فلا خیر لك فی قتلہ "اگر یہ وہی ہے تو تم اس پر قابو نہ پا سکو گے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو اس کے قتل میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں" (مسلم۔ ذکر ابن صیاد)۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے

دجّال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ان یخرج وانا فیکم فانا حجیجہ دونکم وان یخرج ولست فیکم فامرؤٌ حجیج نفسہ واللہ خلیفتی علی کل مسلمٍ "اگر وہ میری موجودگی میں نکلے تو تمہاری طرف سے میں اس کا مقابلہ کرونگا، اور اگر وہ ایسے زمانے میں نکلے جب میں تمہارے درمیان موجود نہ ہوں تو ہر آدمی اپنی طرف سے خود ہی اس کا مقابلہ کرے اور اللہ میرے پیچھے ہر مسلم کا نگہبان ہے" (مسلم، ذکر الدجال)۔ تمیم داری نے اپنے ایک بحری سفر میں دجّال سے اپنی ملاقات کا قصہ جب آپ کو سنایا تو اس کی بھی آپ نے تصدیق یا تکذیب نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اعجبنی حدیث تمیم انہ وافق الذی کنت احدثکم عنہ "مجھے تمیم کا بیان پسند آیا، وہ موافقت رکھتا ہے اس بات سے جو میں دجال کے متعلق تم سے بیان کیا کرتا تھا"۔ پھر آپ نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا الا انہ فی بحر الشام او بحر الیمن، لا بل من قبل المشرق "مگر وہ بحر شام یا بحر یمن میں ہے۔ نہیں بلکہ وہ مشرق کی جانب ہے" (مسلم، قصۃ الجساسہ)۔ یہ سب روایات اپنا مفہوم خود واضح کر رہی ہیں۔

(۳) دوسرے سوال میں آپ نے ایک بڑی سخت بات کہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ایسی بات کہنے سے پہلے کتاب و سنت سے اس کی تحقیق کر لیتے۔ قرآن مجید حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق کہتا ہے وَذَا النُّونِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ "اور مچھلی والا جب کہ وہ غصے میں آکر چلا گیا اور اس نے گمان کیا کہ ہم اسے تنگ نہ پکڑیں گے" (الانبیاء۔ رکوع ۶)۔ یہاں ایک نبی کے لیے اللہ تعالیٰ خود ظن کا لفظ استعمال کر رہا ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی نے قرآن مجید میں بتا دیا ہے کہ ان کا یہ ظن صحیح نہ تھا۔ صحیح مسلم میں کتاب الفضائل کے تحت ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان ہے باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہٗ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرای "باب اس امر کے بیان میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرعی طریقہ پر جو کچھ فرمایا ہو اس کا امتثال واجب ہے نہ کہ اس بات کا جسے آپ نے دنیوی معاملات میں اپنی رائے کے طور پر بیان کیا ہو"۔ اس باب میں امام موصوف حضرت طلحہ، حضرت رافع بن خدیج، حضرت عائشہ اور حضرت انس کے حوالہ سے یہ قصہ نقل کرتے ہیں کہ جب حضور مدینے تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ اہل مدینہ مادہ کھجوریں نر کھجور کا پیوند لگاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا

ما اظن یغنی ذالک شیئاً" میں نہیں سمجھتا کہ اس کا کوئی فائدہ ہے"؛ لعلکم لولم تفعلوا کان خیراً"؟ اگر تم ایسا نہ کرو تو شاید اچھا ہو" لوگوں سے سنا تو ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ مگر اس سال پھل اچھا نہ آیا اس پر آپ نے فرمایا ان کان ینفعکم ذالک فلیصنعوہ فانی انما ظننت ظناً فلا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوا بہ: فانی لم اکذب علی اللہ "اگر لوگوں کو یہ کام نفع دیتا ہے تو وہ ضرور اسے کریں۔ میں نے تو ظن کی بنا پر ایک بات کہی تھی تم ظن پر مجھ سے مواخذہ نہ کرو۔ البتہ جب میں اللہ کی طرف سے کوئی بات تم سے کہوں تو اسے لو کیونکہ میں اللہ پر کبھی جھوٹ نہیں بولا ہوں۔" یہ اللہ کے رسول کی اپنی تصریح ہے، اور اوپر اللہ تعالیٰ کی تصریح بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ آپ کا نظریہ صحیح ہے یا اللہ اور اس کے رسول کا بیان؟

---

## طلاق قبل از نکاح

سوال: میرے ایک غیر شادی شدہ دوست نے کسی وقتی جذبے کے تحت ایک مرتبہ یہ کہہ دیا تھا کہ "اگر میں کسی عورت سے بھی شادی کروں تو اس پر تین طلاق ہے۔" اب وہ اپنے اس قول پر سخت نادم ہے اور چاہتا ہے کہ شادی کرے۔ علماء یہ کہتے ہیں کہ جونہی وہ شادی کرے گا عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی، اس لیے عمر بھر اب شادی کی کوشش کرنا اس کے لیے ایک بیکار اور عبث فعل ہے۔ براہ کرم بتائیں کہ اس مصیبت خیز الجھن سے نکلنے کا کوئی رستہ ہے یا نہیں۔

جواب: بلاشبہ فقہائے حنفیہ کی رائے یہی ہے کہ ایسی صورت میں جس عورت سے اس کا نکاح ہوگا اس پر طلاق وارد ہو جائے گی۔ لیکن تمام ائمہ و فقہاء کا اس بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کی رائے یہ ہے کہ طلاق کا حق نکاح کے بعد پیدا ہوتا ہے نہ کہ نکاح سے پہلے۔ اگر کسی شخص نے یہ کہا ہو کہ وہ آئندہ جس عورت سے بھی نکاح کرے اس کو طلاق ہے تو یہ ایک لغو اور غیر موثر بات ہے۔ اس سے کوئی قانونی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ یہی رائے حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبل، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی منقول ہے، اور اس رائے کی تائید اس

حدیث سے ہوتی ہے کہ لا طلاق الا من بعد نکاح (طلاق نہیں ہے مگر نکاح کے بعد)۔ امام مالک کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی خاص عورت، یا خاص قبیلے، یا خاندان کی عورتوں کے بارے میں کوئی شخص ایسی بات کہے تب تو طلاق لازم آجائے گی لیکن مطلقاً تمام عورتوں کے بارے میں یہ بات کہی جائے تو طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ پہلی صورت میں تو یہ امکان باقی رہتا ہے کہ مرد اُس عورت یا اُس قبیلے کی عورت کے سوا دوسری عورتوں سے نکاح کر سکے، لیکن دوسری صورت میں ترکِ سنت کی قباحت لازم آتی ہے، اور یہ ایک حلال چیز کو اپنے اوپر مطلقاً حرام کر لینے کا ہم معنی ہے۔

مجھے ان مختلف اقوال میں سے امام شافعی اور امام احمد کا قول دلائل کے لحاظ سے قوی اور قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ اگر آنجناب اس کے مطابق فتوے میں تبدیلی فرما دیں تو مناسب ہو۔

---

## اللہ کے حقوق اور والدین کے حقوق

سوال:۔ میں ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہوں اور آپ کی رہنمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میں جماعت کا ہمہ وقتی کارکن ہوں اور اس وجہ سے گھر سے دور رہنے پر مجبور ہوں۔ والدین کا شدید اصرار ہے کہ میں اُن کے پاس رہ کر تجارتی کاروبار شروع کروں۔ وہ مجھے بار بار خطوط لکھتے رہتے ہیں کہ تم والدین کے حقوق کو نظر انداز کر رہے ہو۔ میں اس بارے میں ہمیشہ مشوش رہتا ہوں۔ ایک طرف مجھے والدین کے حقوق کا بہت احساس ہے، دوسری طرف میں محسوس کرتا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے میرا جماعت کا کارکن بن کر رہنا ضروری ہے۔ آپ اس معاملے میں مجھے صحیح مشورہ دیں تاکہ میں افراط و تفریط سے بچ سکوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے گھر میں میری زندگی سخت تکلیف کی ہوگی لیکن شرعاً اگر ان کا مطالبہ واجب التعمیل ہے تو پھر بہتر ہے کہ میں اس تکلیف کو خوشی سے برداشت کروں۔ میرے والد صاحب میری ہر بات کو موردِ اعتراض بنا لیتے ہیں اور میری طرف سے اگر بہت ہی نرمی کے ساتھ جواب عرض کیا جائے تو اسے بھی سننا گوارا نہیں فرماتے۔

جواب:۔ والدین کی اطاعت اور دین کی خدمت کے درمیان توازن کا مسئلہ بالعموم ان سب نوجوانوں

کے لیے وجہ پریشانی بنا رہتا ہے جن کے والدین جماعت اسلامی اور اس کے مقصد سے ہمدردی نہیں رکھتے ہیں
نے عموماً یہ دیکھا ہے کہ ایک بیٹا اگر سرکاری ملازمت میں ہو یا کسی اچھے کاروبار میں لگا ہوا ہو تو والدین
اس کے ہزاروں میل دور رہنے کو بھی برداشت کر لیتے ہیں اور اس سے کبھی نہیں کہتے کہ تو ملازمت یا روزگار
چھوڑ دے اور آکر ہماری خدمت کر۔ بیٹے کے علاوہ اگر فاسد بھی ہوں تو اعتراض کی زبان کھولنے کی ضرورت انہیں
بالعموم محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنے سارے حقوق انہیں صرف اسی وقت یاد آجاتے
ہیں جب کوئی بیٹا اپنے آپ کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر جماعت اسے معقول معاوضہ
دے تب بھی وہ یہی ضد کرتے ہیں کہ بیٹا گھر میں بیٹھ کر اُن کے "حقوق" ادا کرے۔ بلکہ حقوق ادا کرنے پر بھی اُن
کا دل ٹھنڈا نہیں ہوتا، اس کی ہر بات انہیں کھٹکتی ہے اور اس کی کسی خدمت سے بھی وہ خوش نہیں ہوتے۔
یہ صورتِ حال میں ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں اور جماعت کے بکثرت نوجوانوں کو اس صورتِ حال
کا سامنا کرنا پڑا ہے اور کرنا پڑ رہا ہے۔

مَیں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے ہاں فی الواقع کیا صورتِ حال ہے۔ اگر وہی کچھ ہے جو آپ کے بیان سے سمجھ میں آرہی ہے تو یہ آپ کے والدین کی زیادتی ہے۔ آپ جہاں کام کر رہے ہیں وہیں کرتے رہیں، جو کچھ مالی خدمت آپ کے بس میں ہو وہ بھی کرتے رہیں بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنی مقدرت سے کچھ زیادہ ہی بھیجتے رہیں اور حسبِ ضرورت وقتاً فوقتاً اُن کے پاس ہو آیا کریں۔ لیکن اگر صورتِ حال اس سے مختلف ہو اور فی الواقع آپ کے والدین اس بات کے محتاج ہوں کہ آپ کے لیے اُن کے پاس رہ کر ہی خدمت کرنا ضروری ہو تو پھر مناسب یہی ہے کہ آپ ان کی بات مان لیں۔

# مطبوعات

رنگِ سحر | مرتبہ، جناب طالب حجازی صاحب ناشر: حلقہ ادب اسلامی۔ حافظ آباد۔ قیمت عہ

یہ حافظ آباد کے اسلامی رجحانات رکھنے والے نوجوانوں کی نگارشات کا ایک مجموعہ ہے جس کے آغاز میں افرادِ حلقہ کا تعارف درج ہے۔ علاوہ بریں ادبی مسائل پر ملک کی بعض نمایاں شخصیتوں سے آراء حاصل کرکے مجموعہ کی زینت بنائی گئی ہیں۔ یوں تو نوجوانوں کا جو جذبہ اس میں کام کر رہا ہے وہ بہت متاثر کرتا ہے، مگر جب سوال معیارِ انتخاب کا سامنے آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ طالب حجازی جیسے ادیب نے ایک انتخابی مجموعہ مرتب کرتے ہوئے ڈھیلا ڈھالا معیار کیونکر سامنے رکھ لیا۔ لوگ کہیں گے کہ اگر ایک چمن کی یہ بہار ہو تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ماہنامہ سوداگر، خاتون نمبر | بہ ادارت: سلطان احمد اللہ والے و جمیل الرحمٰن صاحبان۔ دفترِ اشاعت: برنس روڈ کراچی۔ قیمت خاص نمبر عہ

عورت پہلے بھی کمزور مخلوق تھی، لیکن آج تو وہ قدیم جاہلیت اور جدید جاہلیت کے دو گونہ گردابوں میں بری طرح غوطے کھا رہی ہے۔ نظریات اور کلچر اس بری طرح ٹکرا رہے ہیں کہ مردوں کے سر چکرا چکرا جاتے ہیں، بیچاری عورت تو اور زیادہ سخت ابتلا کا شکار ہو رہی ہے۔ اس وقت ہماری خواتین صحیح ذہنی رہنمائی اور نظریاتی سہارے کی شدید محتاج ہیں۔ ماہنامہ سوداگر کے ادارہ نے اسی ضرورت کا احساس کرکے خاتون نمبر نکالا ہے۔ اس نمبر پر ہم تفصیلی اظہارِ رائے تو نہیں کر سکتے۔ بس اتنا ہی کہیں گے کہ ایک طرف اس مجموعۂ نگارشات کا فکری محور اسلام ہے۔ دوسری طرف حالات کے جدید تقاضے لکھنے والوں کے سامنے ہیں، پھر تنوع دلچسپی کو بڑھانے والا ہے۔ ملک کے بعض چوٹی کے لکھنے والوں نے اس کی ترتیب میں حصہ لیا ہے۔ ہم اسے اپنے موضوع پر ایک کامیاب نمبر قرار دیتے ہیں اور خواتین کو اس کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔

موتیوں کا ہار | مرتبہ: جناب افضل حسین صاحب ایم اے۔ ایل ٹی۔ ناشر: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور، یو۔ پی۔ قیمت حصہ اول ۳ر، حصہ دوم نامعلوم، حصہ سوم ۵ ر

مؤلف کا میدان "درسیات" ہے۔ اسلام کو ایک نظامِ زندگی اور ایک تمدنی تحریک کی حیثیت سے ذہن

میں رہ کر جدید تعلیمی نظریات کی روشنی میں مختلف مدارج کے طلباء کے لیے آپ نے جو نصابی کتابیں لکھی ہیں وہ برِصغیر ہند و پاک میں خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ اب موصوف نے لڑکیوں کا حق ادا کرنے کے لیے یہ نیا سلسلہ مرتب کیا ہے۔ زبان بہت آسان، مطالب نہایت عمدہ اور اندازِ ترتیب درسی ضروریات کے مطابق ہے تینوں حصوں میں ذہنی لحاظ سے موزوں تدریج پائی جاتی ہے۔ توقع ہے کہ مسلمان گھروں میں سونے اور موتیوں کے ہاروں سے زیادہ اس ایمانی و اخلاقی ہار کی قدر کی جائے گی۔

**حیواناتِ قرآنی** | از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی۔ شائع کردہ: مکتبہ ندوۃ المعارف (بنارس۔ الٰہ آباد کلکتہ)۔ قیمت مجلد عہ

مولانا عبدالماجد صاحب مدیر صدقِ جدید نے اس مختصر کتاب میں اُن تمام حیوانات کا ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ کتاب کی ترتیب لغت کے طرز پر حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہے۔ ہر جانور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس کا ذکر قرآن میں کہاں کہاں کس سلسلۂ بحث میں آیا ہے اور اس کے بارے میں دوسری معلومات بھی دی گئی ہیں۔ اگرچہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو سمجھ میں نہیں آیا، تاہم قرآن مجید کی علمی خدمت کا یہ ایک نیا گوشہ ہے اور اس کتاب پاک کی خدمت کا جذبہ بجائے خود قابلِ قدر ہے۔

**آسان ریاضی** | از جناب شوکت علی صاحب بی اے، ایل ٹی۔ شائع کردہ: مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور۔ یوپی۔ قیمت ۴ ار

یہ بھی ایک نصابی سلسلہ ہے جس کا چوتھا حصہ ہمارے سامنے ہے۔ پیش لفظ سے واضح ہے کہ حسابی قاعدوں کو جدید طریقِ تعلیم کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ پھر "اسلامی رنگ" حساب کے سوالوں میں حل کر دیا گیا ہے۔ اعدادِ مفرد و مرکب اور ان کے اجزائے ضربی نکالنا، اجزائے ضربی کے ذریعے ضرب و تقسیم کرنا، عادِ اعظم، ذواضعافِ اقل، کسور اور ان کی جمع و تفریق، چاروں مفرد و مرکب قاعدوں کا عملی زندگی میں استعمال، کسورِ اعشاریہ دسویں تک لکھنا اور پڑھنا، آمد و خرچ کا حساب مرتب کرنا، علم ہندسہ کے مبادیات نیز ضروری اوزان اور پیمانے، آسان ریاضی کے حصہ چہارم کے ذریعے بچوں کو سکھائے جا سکتے ہیں۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ پاکستان کے مرتبینِ نصابیات اور اساتذۂ کرام اس سلسلے کا بغور مطالعہ کریں اور بچوں کو اس سے استفادہ کرنے کی ترغیب دلائیں۔ مدارس

کی لائبریریوں میں بھی اس کا رکھنا مفید ہوگا۔

**مثنوی الواحِ زبرجد** | از جناب ابوسعید صاحب بذری ملنے کا پتہ درج نہیں قیمت دو روپے۔

یہ ایک طویل فارسی مثنوی ہے جس کا مقصد "احیائے خودی" ہے۔ شاعر کا سرچشمۂ فکر اسلام ہے اور وہ ایک مسلمان کی نگاہ سے اپنے معاشرے کو دیکھتا ہے اور اس کے علماء، صوفیاء، اہل قلم، شعراء، نوجوانوں اور عوام کو جھنجھوڑ کر زندگی میں ایک صالح تغیر برپا کرنے کے لیے آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے سامنے وہ کون لوگ ہیں جن کے لیے اس نے فارسی زبان کو ذریعہ بنایا ہے اور ترتیب مثنوی کا ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے جس سے آج کا ذہن بہت دور نکل آیا ہے۔ پھر یہ کہ شعریت حد درجہ کمزور ہے اور شعر، خصوصاً مثنوی کے لیے وہ مناسب زبان پیدا نہیں کر سکا۔ ترکیبِ اضافت، مسخ تلفظ اور نامانوس الفاظ کے استعمال کی بھرمار ہے جس کی وجہ سے ایک صاحبِ ذوق کے لیے مثنوی کا پڑھنا بوجھ بن جاتا ہے۔

**کیا دین قائم ہے؟** | از جناب ڈاکٹر شیدا قادری۔ شائع کردہ: مکتبہ تعمیر انسانیت، ۲۵۰ گوجر گلی، موچی دروازہ لاہور۔ قیمت درج نہیں۔

اس پمفلٹ میں ایک قلب حساس نے دردمندانہ جذبات سے اس تضاد کو نمایاں کیا ہے جو ہمارے عقیدہ و عمل اور ہمارے انفرادی دین اور اجتماعی نظام میں پایا جاتا ہے۔

**WHY ISLAMIC CONSTITUTION ONLY.** | از جناب چوہدری علی احمد خاں۔ شائع کردہ: جہانِ نو پبلیکیشنز، ڈھاکہ قیمت ۸/

آج جبکہ اسلام کے نام پر ایک مسلمان قوم کے ہاتھوں بے حساب قربانیوں سے قائم ہونے والی سلطنت پاکستان میں ایک بگڑے ہوئے عنصر نے دستور کے مسئلے پر فکری انتشار پیدا کر دیا ہے، یہ انگریزی پمفلٹ مفید ذہنی رہنمائی بہم پہنچاتا ہے۔ تھوڑے صفحات میں وہ ٹھوس دلائل صراحت سے بیان کر دیے گئے ہیں جو اسلامی دستور کے متقاضی ہیں۔ معیارِ طباعت اچھا ہے۔

**پاکستان میں اُردو کا مسئلہ** | مرتبہ: جناب محمد رکن الدین صاحب حسان (عثمانیہ) معتمد اردو کانفرنس۔

اردو کانفرنس کا انعقاد انجمن طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ (پاکستان)، کراچی کا مرہونِ منت ہے۔ یہ پمفلٹ زبان کے مسئلے میں انہی حضرات کا نقطۂ نظر سامنے لاتا ہے۔ خلاصۂ مدعا یہ ہے کہ اردو کو صوبائی بولیوں سے

لڑائے بغیر اور علاقائی حدود میں ان کے فروغ کو روکے بغیر قومی زبان کی حیثیت سے اس کی ترویج کے لیے ایسی صورتیں اختیار کی جائیں جن کے ذریعے پاکستان کے جملہ علاقائی عناصر کی دلی رضامندی حاصل ہو سکے پمفلٹ خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے۔

**آدم - نوح** | مرتبہ: عبید الحق صاحب۔ شائع کردہ: المکتبۃ العلمیہ۔ ۵، لیک روڈ، لاہور۔ قیمت ہر ایک ۵ ر۔

یہ دونوں پمفلٹ دو جلیل القدر انبیاء کے قرآنی حالات پر مشتمل ہیں اور بچوں کے مطالعہ کے لیے عربی سے اُردو میں ترجمہ کیے گئے ہیں۔ زبان مناسب، ترجمہ صاف!

**رفیق النکاح** | مؤلفہ: مولوی محمد ظفر صاحب بی اے، ایل ایل بی، وکیل، سرگودھا۔ ۱ر کی ٹکٹیں بھیج کر مؤلف سے حاصل کریں۔

"سلکِ مروارید" کے نام سے مؤلف نے ایک اشاعتی سلسلہ شروع کر رکھا ہے جو کم سے کم ۴ ر ماہانہ کے چندہ پر بہم پہنچایا جاتا ہے۔ اسی کی ایک کڑی یہ کتابچہ ہے جو پاکٹ بک سائز پر ہے۔ اس میں مکالمہ کے انداز میں مسائلِ نکاح بیان کیے گئے ہیں۔

**ماہنامہ "الفقر"** | بادارت: جناب محمد سرور صاحب قریشی۔ مقام اشاعت: تعلیمی پریس، گرین ووڈ اسٹریٹ سیالکوٹ۔ فی پرچہ ۵ ر۔ چندہ سالانہ ۳ روپے۔

نام سے مغالطہ نہ ہو، یہ ماہنامہ طالب علموں اور بچوں کے لیے شائع ہوتا ہے۔ مزاج اسلامی ہے اور نقطۂ نظر تعلیمی۔ معیارِ طباعت آہستہ آہستہ ترقی کر رہا ہے۔

**THE ESSENCE OF ISLAMIC TEACHINGS.** | از قلم: سید نواب علی صاحب۔ ناشر: اشرف پبلیکیشنز، لاہور۔ قیمت ۸/۰ ر۔

یہ کتاب اسلام کا ایک اجمالی تعارف کرانے کے لیے انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ ہماری ملت میں یہ ایک صاف نقطۂ نظر کو لیے ہوئے ہے اور اس کے پس منظر میں خاصا مطالعہ جھلکتا ہے۔ میٹرک تک کی استعداد رکھنے والے طلبہ کے لیے بھی بہت مفید رہے گی۔ طباعتی معیار بہت اچھا ہے۔

**NOTES ON IQBAL'S ASRAR-I-KHUDI.** | از جناب آر تھر جے آربری۔ ناشر: اشرف پبلیکیشنز، لاہور۔ قیمت ۸/۰ ر۔

یہ اقبال کی مشہور فارسی مثنوی "اسرارِ خودی" کا انگریزی زبان میں مصرع بمصرع

ترجمہ ہے ۔ افسوس کہ ہم ترجمہ کی نوعیت کا تفصیلی جائزہ نہیں لے سکے ۔ طباعتی معیار اچھا ہے ۔

**COMPLAINT AND ANSWER.** از جناب آر تھرجے ۔ آربری ۔ ناشر : شیخ محمد اشرف پبلشر کشمیری بازار لاہور ۔ قیمت دو روپے ۔ یہ اقبال کے شکوہ وجواب شکوہ کا انگریزی میں ترجمہ ہے ۔ طباعت کا معیار اچھا !

**حصولِ تیسیر بیان** مؤلفہ : جناب عنایت اللہ اثری ، مدرس دار الحدیث ، گجرات پنجاب ۔ ملنے کا پتہ :۔ ناظم انجمن اہلِ حدیث ، گجرات ، پنجاب ۔ قیمت ۸؍

کتاب کا موضوع " اصولِ تفسیر " ہے ۔ اصول اس انداز سے بیان کیے گئے ہیں کہ ساتھ ساتھ اہم تفسیری مواقع کی مثالیں دی گئی ہیں ۔ پیرایہ سوال وجواب کا سا ہے ۔ اسلوب کلام علماء کا سا ہے ۔ طباعتی معیار بہت سادہ !

**تیسیر الصرف** تالیف جناب حاجی محمد ابراہیم بن مولوی نظام الدین صاحب ، منڈی عارف والہ ۔ مؤلف سے طلب کریں ۔ قیمت درج نہیں ۔

عربی کے قواعدِ صرف اجمال سے بیان کیے گئے ہیں ۔ اسلوب پرانا ، معیارِ طباعت سادہ !

## (بقیہ اشارات)

معاشرے میں کسی صالح عنصر کا بقا بھی ممکن نہیں رہتا۔ اس چکر کو توڑنا ضروری ہے اور اس کے توڑنے کی ابتدا بہر حال حکومت کی طرف سے ہونی چاہیے۔ وہ ابتدا نہ کرے تو معاشرے کا کوئی غیر سرکاری عنصر اصلاح حال کے لیے کچھ کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے قواعد ہر شخص کو راستی سے انحراف پر مجبور کر دیتے ہیں۔ البتہ اس کی طرف سے اصلاح کا آغاز ہو تو قوم ابھی اتنی بے جان نہیں ہے کہ اس جوابی تعاون کی امید نہ کی جاسکے۔ انکم ٹیکس ہی کے معاملے کو لیکر مثال کے طور پر ہم بتاتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے اس چکر کو توڑنے کی ابتدا کس طرح ہوسکتی ہے اور پبلک کی طرف سے تعاون کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے۔

(۱) نئے دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی مؤثر انداز میں کاروباری طبقے سے عام اپیل کی جائے کہ وہ اپنے حسابات ایمانداری کے ساتھ رکھیں اور اپنی قومی حکومت کے ساتھ راستبازی سے معاملہ کریں۔ وہ اگر اپنی روش بدل دیں تو حکومت بھی ان کو راستباز تسلیم کرتے ہوئے ان سے معاملہ کریگی اور کسی کے سابق رویہ کو اس کے خلاف حجت نہ بنایا جائے گا۔

(۲) انکم ٹیکس کی حد سے بڑھی ہوئی شرحوں پر نظر ثانی کی جائے، کیونکہ وہ لوگوں کے لیے جعلی حسابات رکھنے اور حقیقی آمدنی چھپانے کا ایک بڑا محرک بن گئی ہیں۔ نیز کم سے کم آمدنی جس پر ٹیکس نہیں لگتا اس کا نصاب بڑھایا جائے۔ زکوٰۃ اور خیرات کی رقوم کو اخراجات میں شمار کیا جائے اور زیادہ عیالدار آدمیوں کو ذاتی اخراجات کے معاملہ میں زیادہ الاؤنس دیا جائے۔ ظاہری حساب کے لحاظ سے تو اس طرح حکومت کی آمدنی کم ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اگر لوگ ایمانداری کے ساتھ ٹیکس ادا کرنے لگیں تو ان رعایتوں کے باوجود آمدنی زیادہ ہونے کی امید ہے۔

(۳) حکومت کی اس اپیل کو مؤثر بنانے کے لیے ریڈیو، پریس اور پلیٹ فارم سے اخلاقی تبلیغ کی ایک مہم شروع کی جائے اور لوگوں میں راستبازی کی حس بیدار کرنے کے لیے پیہم سعی کی جاتی رہے۔

(۴) ہر جگہ کاروباری طبقوں کی مقامی انجمنیں منظم کی جائیں جو اس بات کا ذمہ لیں کہ اپنے اپنے پیشے کے لوگوں کو صداقت و دیانت پر آمادہ کرینگی، اور غلط روش اختیار کرنے والوں پر اخلاقی دباؤ ڈالیں گی۔

(۵) انکم ٹیکس کے حکام کو ہدایت کی جائے کہ وہ ہر شخص کو جھوٹا فرض کر کے اندھا دھند ٹیکس نہ لگائیں، بلکہ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کے لیے ہر ممکن کوشش کریں جن کی صداقت پر شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔

اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے شعبہائے زندگی میں حکومت کس طرح اصلاح کا آغاز کرسکتی ہے اور اس میں پبلک کا تعاون کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

صفحه خالی

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس ، لاہور میں چھپا